ایک عام آدمی کا خواب

رشید امجد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک عام آدمی کا خواب

رشید امجد

حرف اکادمی ○ راولپنڈی

ریان اور ایمن

کے نام

اہتمام: کرنل (ر) سید مقبول حسین (ستارۂ امتیاز)

کتاب: ایک عام آدمی کا خواب

مصنف: رشید امجد

اشاعت: جولائی 2006ء

کمپوزنگ، سرورق: ناصر عرفات

تعداد: پانچ سو

قیمت: 130روپے

مطبع: محمود برادرز پرنٹنگ پریس گوالمنڈی راولپنڈی

ناشر: حرف اکادمی 304/G پشاور روڈ، راولپنڈی

فون 051-5850317

ترتیب

بگل والا

یہ کہانی مجھے اس نے سنائی جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں لیکن اسے اصرار ہے کہ اس کہانی سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک عام سی جگہ پر مجھے اچانک ہی مل گیا تھا۔ شاید اچانک نہیں کہ میں اس کا منتظر تھا اور یہ کہانی سننا چاہتا تھا۔

کہانی کا زمانہ بیسویں صدی کی پہلی، دوسری، تیسری یا کوئی بھی دہائی ہوسکتی ہے۔ انیسویں صدی بھی ہوسکتی ہے اور شاید اکیسویں صدی بھی۔ بہرحال زمانے سے کیا فرق پڑتا ہے، جگہ بھی کوئی سی ہو سکتی ہے۔ یہاں وہاں، کہیں بھی، لیکن نہیں یہ کہانی وہاں کی نہیں یہیں کی ہے۔ کرداروں کے نام بھی ا،ب،ج کچھ بھی ہو سکتے ہیں کہ نام تو شناخت کی نشانی ہیں اور ہماری کوئی شناخت ہے ہی نہیں تو پھر نام ہوئے بھی تو کیا، نہ ہوئے تو کیا۔

ایک چھوٹی سی چھاؤنی میں کہ اس وقت چھاؤنیاں چھوٹی ہی ہوتی تھیں، آج کی طرح پورے کا پورا شہر چھاؤنی نہیں ہوتا تھا، تو اس چھوٹی سی چھاؤنی میں ایک بگل چی رہتا تھا، اس کے بگل پر چھاؤنی جاگتی تھی، صبح سویرے گہری نیند سوتے فوجی بگل کی آواز پر چونک کر اٹھتے، جلدی جلدی کپڑے پہنتے اور نیم غنودتے، قطاروں میں آ کر کھڑے ہو جاتے، بگل کی لے اور اس کے اتار چڑھاؤ پر ڈرل شروع ہوتی۔ سپاہی سے افسر تک سب اس کی بگل کی آواز پر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہوتے اور جب تک بگل بجتا رہتا، ان کی بھاگ دوڑ جاری رہتی۔ بگل بجاتے ہوئے، بگل والے کی آنکھوں میں تفاخر کی ایک شان ہوتی، اسے اس بات کا احساس

تھا کہ اس کے بگل کی آواز پر پوری پلٹون اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہے اور وہ اکثر اپنی بیوی سے بھی اس کا ذکر کرتا۔

''بھلی مانس، میرا بگل نہ بجے تو پوری پلٹون سوئی رہ جائے۔''

بیوی بے نیازی سے شانے ہلاتی تو وہ کہتا، ''جھوٹ نہیں بولتا، سپاہی کی تو کیا حیثیت ہے، بڑا افسر تک میرے بگل کے تابع ہے۔'' پھر خود ہی اس کا سر بلند ہو جاتا ...... ''میں کوئی معمولی چیز نہیں۔''

وہ اپنے بگل کو تھپتھپاتا ''پوری پلٹن کیا، ساری چھاونی اس کی ماتحت ہے۔''

اب بیوی کی آنکھوں میں خاوند کے لیے ایک سرشاری کی نمی سی آ جاتی ...... واقعی وہ سچ ہی کہتا ہو گا اور اسے بگل والے کی بیوی ہونے پر ایک فخر کا سا احساس ہوتا۔

بگل والا کبھی کبھی اپنے دوستوں سے بھی کہتا ...... ''یہ بگل نہیں اس کی آواز میں ایک جادو ہے اور اس جادو کا جادوگر میں ہوں۔''

اس کا سینہ پھول جاتا ...... ''اس کی آواز پر تو کمانڈنٹ بھی اپنے بستر کی گرمی چھوڑ کر گراؤنڈ میں آ جاتا ہے۔''

چھاؤنی میں چھوٹی موٹی پارٹیاں ہوتی ہی رہتی تھیں جس میں میاں بیوی دونوں کو دعوت دی جاتی۔ افسروں کی پارٹیوں میں تو عام سپاہیوں کو شرکت کی اجازت نہ تھی لیکن سال میں دو ایک بار بڑے دربار منعقد ہوتے جس میں سب کو دعوت دی جاتی۔ بگل والے کی بیوی کبھی کسی پارٹی میں نہ گئی، اسے احساس تھا کہ وہ ایک عام سپاہی کی بیوی ہے لیکن اب ایک عرصے سے بگل والے نے اپنی اہمیت کے ایسے ایسے قصے سنائے تھے کہ وہ اس بار بڑے دربار میں شریک ہونے پر تیار ہو گئی۔ بگل

والے نے کہا، ''بھلی مانس کوئی اچھا جوڑا پہننا، تم کوئی معمولی عورت نہیں، بگل والے کی بیوی ہو، جس کے بگل کی آواز پر کمانڈنٹ بھی اٹینشن ہو جاتا ہے۔''

شادی کے ابتدائی دنوں کا ایک جوڑا ایسا تھا جسے دو ایک بار ہی پہنا گیا تھا۔ کہیں جانے کا موقع ہی کب ملتا تھا۔ بیوی نے جوڑا نکالا، اسے کئی رُخوں سے دیکھا، خوب جی لگا کر استری کیا، پہنا تو اس کی چھب ڈب ہی بدل گئی۔ بگل والا خود دم بخود رہ گیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی بیوی بہت خوب صورت اور بڑی پُروقار ہے۔ اسے اکثر افسروں کی بیویوں کو دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

''ایک افسر کی بیوی بھی ایسی نہیں۔'' اس نے سوچا۔

''اس کے تو پاؤں کی خاک بھی نہیں۔'' اور اسے یک دم فخر کا احساس ہوا۔ ''اور میں بھی تو بگل والا ہوں جس کے بگل کی آواز پر پوری کی پوری پلٹن اٹینشن ہو جاتی ہے۔''

بیوی غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

''اچھا نہیں لگ رہا؟''

''اچھا ...... بھلی مانس، اتنا اچھا کہ بڑے سے بڑے افسر کی بیگم بھی تمہارے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔'' وہ لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا، ''تم اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہو، پُروقار۔''

بیوی کے چہرے پر شفق کے کئی رنگ ابھرے۔

اسے ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اگر یہ کسی افسر کی بیوی ہوتی اور اس طرح لش پش پارٹی میں آتی تو سارے اس کے ارد گرد ہو جاتے اور طرح طرح سے اس کی تعریفیں کرتے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو پرے

پھینک دیا ...... ''ٹھیک ہے، میں سپاہی سہی لیکن معمولی سپاہی نہیں بگل بردار ہوں، میرے بگل پر تو کمانڈنٹ بھی سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔'' اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ اس نے بیوی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ...... ''ٹھیک، بالکل ٹھیک، فِٹ۔''

پنڈال میں عورتوں اور مردوں کے راستے الگ الگ تھے۔ وہ پہلی بار اس طرح کی کسی محفل میں آئی تھی، اس لیے گھبرائی سی تھی۔ الگ الگ راستے دیکھ کر بولی، ''تو تم اور میں الگ الگ ہوں گے۔''

''تو اس میں کیا ہے؟ تمہارے ساتھ اور عورتیں بھی تو ہوں گی۔'' پھر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ''اور تم کوئی معمولی عورت نہیں، بگل بردار کی بیوی ہو، جس کے بگل پر ....''

اس نے باقی بات نہیں سنی اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ ابھی بہت کم لوگ آئے تھے۔ کرسیاں تقریباً خالی تھیں۔ وہ سب سے اگلی قطار میں جا بیٹھی جہاں صوفے لگائے گئے تھے۔ تین چار لوگ جو انتظام پر مقرر تھے، اسے اگلے صوفے پر بیٹھتے دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نے اشارے سے دوسرے سے پوچھا، ''یہ کون ہے؟'' دوسرے نے نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک نے آگے بڑھ کر بڑے مؤدّب انداز میں پوچھا، ''آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟''

''یہیں سے۔'' اس نے اپنے انداز میں جواب دیا۔

اس کے لہجے سے پوچھنے والے کا مؤدّب انداز یک دم بدل گیا۔ اس نے قدرے روکھے انداز میں پوچھا، ''آپ کی تعریف۔''

''تعریف''، اسے سمجھ نہ آیا کہ تعریف کے کیا معنی ہیں۔

پوچھنے والے کا رہا سہا مؤدّب انداز بھی ختم ہو گیا۔اب کے اس نے سرد لہجے میں پوچھا، ''آپ کس کی مسز ہیں؟''

مسز کے معنی اسے معلوم تھے، اس نے کہا، ''بگل دار۔''

اس نے اپنی طرف سے بگل دار پر بہت زور دیا تھا لیکن سننے والا ذرا متاثر نہ ہوا بلکہ اس کے چہرے پر ایک کرختگی آ گئی، ''آپ پیچھے آ جائیں ...... یہ کمانڈنٹ صاحب کی بیگم اور ان کے مہمانوں کی نشستیں ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے اسے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے یا کیا کرے، پھر جیسے کوئی مشین حرکت کرتی ہے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پچھلی قطار میں جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر میں بیگمات کی آمد شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے سے سلام دعا کرتی وہ کرسیوں پر بیٹھنے لگیں۔ آدھی سے زیادہ کرسیاں بھر گئیں۔ اتنے میں ڈپٹی کمانڈنٹ کی بیگم اندر آئی۔ انتظام کرنے والے ان کی طرف دوڑے گئے۔ جھک جھک کر آداب بجا لائے اور ان کے لیے نشست تلاش کرنے لگے۔ گھومتی نظریں اس پر آن ٹکیں۔ وہی شخص جس نے اسے صوفے سے اٹھایا تھا، پاس آیا اور بولا، ''یہاں ڈپٹی صاحب کی بیگم بیٹھیں گی، آپ پیچھے چلی جائیں۔'' اسے لگا جیسے کسی نے اسے تالاب میں غوطہ دے کر باہر نکال لیا ہے۔ کچھ کہے بغیر پسینہ پونچھتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ آدھی سے زیادہ قطاریں بھر گئی تھیں۔ وہ ایک خالی قطار کے کونے میں جا بیٹھی۔ فنکشن شروع ہونے میں ابھی دیر تھی اور مہمان آ رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے یہ قطار بھی بھر گئی۔ اس سے پچھلی دو قطاروں میں بھی خواتین بیٹھ گئیں۔ اب صرف آخری قطار خالی رہ گئی۔ اتنے میں کوارٹر ماسٹر کی بیوی اندر آئی۔ عہدے کے اعتبار سے تو اس کا خاوند نائب صوبیدار تھا لیکن راشن اور دوسری چیزوں کے لیے سب کو کوارٹر ماسٹر کی خوشامد کرنا پڑتی تھی۔

اسے دیکھ کر انتظامیہ کے سارے لوگ اس کی طرف بڑھے اور ساتھ ہی اس کے لیے نشست کی تلاش شروع ہو گئی۔ ایک بار پھر اسے اپنی جگہ سے اٹھایا گیا۔ اب صرف آخری قطار تھی۔ وہ پسینوں پسین شرم سے گردن گردن زمین میں ڈوبی اپنی جگہ سے اٹھی اور آخری قطار کی آخری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری خواتین مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہی ہیں اور ایک دوسرے سے چہ مگوئیاں کر رہی ہیں۔

بگل بردار ...... بگل بردار ...... بگل بردار، جیسے آواز سیٹیاں بجاتی اس کے کانوں میں بگل بجا رہی تھی۔ اسے بالکل معلوم نہ ہوا کہ کب فنکشن شروع ہوا، کب ختم ہوا۔ چائے کب پی گئی اور کب لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، یوں لگ رہا تھا، کسی نے اس کی آنکھوں کو پتھرا دیا ہے اور ٹانگیں پتھر کی سِلیں بن گئی ہیں۔

بہت دیر ہو گئی اور وہ باہر نہ نکلی تو بگل بردار اسے تلاش کرتا اندر آ گیا۔ وہ اسی طرح چپ اپنی کرسی پر بیٹھی تھی جیسے کسی نے اسے اور کرسی کو ایک ہی پتھر سے تراشا ہے۔

''بھاگوان، سب چلے گئے اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔''

وہ کچھ نہ بولی، دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

''خیر تو ہے نا ...... تم ٹھیک تو ہو نا؟'' بگل بردار گھبرا گیا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گیا۔ وہ آگے آگے اور بگل بردار پیچھے پیچھے۔ راستے بھر اس نے کوئی بات نہ کی لیکن گھر کی دہلیز پار کرتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اتنی تذلیل ...... اتنی تذلیل۔''

بگل بردار کے بار بار پوچھنے پر وہ ہچکیوں کے درمیان بس اتنا ہی کہہ پاتی
......''اتنی تذلیل۔''

''آخر ہوا کیا؟'' اب بگل بردار کو غصہ آنے لگا۔ ''کچھ کہو بھی تو۔''
معلوم نہیں کیسے توڑ توڑ کر، وقفوں وقفوں سے اس نے ساری بات سنائی۔ بگل بردار چپ ہو گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ چھت پر چلا گیا اور منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ بس ایک چپ تھی جو اس کے ارد گرد سرسرا رہی تھی۔ منڈیر پر کہنیاں ٹکائے وہ چھاؤنی کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، پھر اچانک اس کے جی میں جانے کیا خیال آیا کہ وہ تیزی سے مڑا، نیچے آیا۔ بیوی کپڑے بدلے بغیر چارپائی پر لیٹ گئی تھی۔ سوتے میں بھی لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ رہے ہیں۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے دیوار سے بگل اٹھایا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔

چھاؤنی کا سارا علاقہ سنسان تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اس چبوترے پر چڑھ گیا جہاں کھڑے ہو کر روز صبح بگل بجایا کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوئی ہوئی بیرکوں اور بنگلوں کو دیکھا اور پوری توانائی سے بگل بجانے لگا۔

کچھ ہی دیر میں ساری چھاؤنی میں ہلچل مچ گئی۔ بیرکوں میں سوئے ہوئے سپاہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھڑیوں پر نظر ڈالی، ایک دوسرے کو دیکھا۔ بگل کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ جوان افسر سب پتلونیں چڑھاتے، تسمے کستے پریڈ میدان کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ کمانڈنٹ، ڈپٹی کمانڈنٹ سب آگے پیچھے، ایک دوسرے سے پوچھتے...... ''کیا ہوا...... اس وقت کیوں؟''

قطاریں بن گئیں، بگل مسلسل بج رہا تھا۔ چھوٹے افسر نے بڑے سے،

بڑے نے اپنے بڑے سے، ڈپٹی نے کمانڈنٹ سے پوچھا، ''سر یہ ایمرجینسی کیسی؟''

کمانڈنٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ بگل تھا کہ مسلسل بج رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ سینہ دھونکنی بن گیا تھا لیکن بگل .... جب کمانڈنٹ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے بگل چھینا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، بہے جا رہے تھے، کچھ کہے بغیر وہ چبوترے سے اترا اور روتے روتے دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

ایک عام آدمی کا خواب

انگلیاں شل اور آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

انگلیاں اس چینل کو تلاش کرتے کرتے شل ہو گئی ہیں جہاں سے وہ اپنی پسند کی خبریں سننا چاہتا ہے، اور آنکھیں اس خبر کی سرخی کو تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہیں جسے پڑھنے کا وہ مدتوں سے منتظر ہے لیکن نہ منظر بدلتا ہے نہ چینل ملتا ہے، نہ وہ سرخی نظر آتی ہے، شروع شروع میں صرف ٹی وی کا چینل تھا، اس کا خیال تھا کہ شاید وہ خبر جسے سننے کو اس کے کان ترس گئے ہیں، کسی اور چینل پر سنی جا سکتی ہے، نئی نئی ڈِش آئی تو خاصی مہنگی تھی، جن دو چار ملنے والوں کے پاس ڈِش تھی، وہ ان سے کرید کرید کر خبریں پوچھتا۔

''کوئی تازہ خبر؟''

جواب دینے والا خبروں کی بجائے تفریحی پروگراموں کا ذکر کرتا، نیم عریاں جسموں کے گداز پن کو چسکے لے لے کر بیان کرتا، وہ اَن سنی کرتے ہوئے پوچھتا۔

''خبریں بھی تو سنی ہوں گی؟''

عموماً جواب ملتا ''یار خبریں تو کم ہی سنتے ہیں۔''

وہ مایوس ہو جاتا، ذرا ڈِش سستی ہوئی تو اس نے کچھ پیسے جوڑ کر بیوی کی مخالفت کے باوجود ڈِش لگوا لی۔ بچوں کی ضِد تھی کہ وہ سائیڈ رکھی جائے جہاں تفریحی پروگرام زیادہ ہیں، لیکن اس نے ان کی تمام تر مخالفت کے باوجود خبروں والے حصے کو ترجیح دی۔ اس طرف تفریحی چینل دو تین ہی تھے۔ اب تو روز رات گئے تک، جب

بچے سو جاتے، خبروں کے چینل کو آگے پیچھے کرتا رہتا، لیکن وہ خبر کہیں نہ تھی، مگر وہ مایوس نہ ہوا۔

ایک نہ ایک دن تو اس خبر کو آنا ہی ہے، اس دوران وہ صبح اٹھتے ہی اخبار بھی دیکھتا، وہ سرخی کب لگے گی؟ زندگی کے پچاس برس بیت گئے، وہ سرخی کب لگے گی؟ لگے گی بھی کہ نہیں، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو ڈانٹ دیتا۔ ایک دن اسے خیال آیا شاید وہ خبر کہیں درمیان میں چھپ جائے اس کے گھر جو اخبار آتا تھا، اس کی ایک ایک سطر پڑھ کر اسے احساس ہوتا کہ یہ وہی چبائے ہوئے بے معنی حرف ہیں، جن کو ایک ڈھیر کی صورت اخبار کے صفحات میں پھیلا دیا جاتا ہے، اس نے سوچا کہ شاید کوئی دوسرا اخبار بہتر ہو لیکن ایک سے زیادہ اخبار لینا اس کی عادت نہیں تھی، دفتر میں بھی ایک اخبار آتا تھا۔ اس نے گھر کا اخبار مختلف کرا لیا، لیکن یہ دوسرا اخبار بھی ہر صبح مردہ لفظوں کا ایک ڈھیر اس کے سامنے پھیلا دیتا جن میں سے اٹھنے والی سڑاند اسے دن بھر پریشان رکھتی۔ اب اس نے ایک اور طریقہ اپنا لیا، صبح ذرا جلدی گھر سے نکل پڑتا اور دفتر جانے سے پہلے اخباروں کے اسٹالوں پر کچھ دیر رک جاتا جہاں کئی اخبار لٹک رہے ہوتے۔ وہ جلدی جلدی سب پر ایک نظر ڈالتا۔ وہی سڑاند بھرے مُردہ لفظ، ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے، وہی پرانی خبریں نئے نئے انداز سے، وہی چہرے، صرف ماسک بدلتے۔ یہ تو وہی لاشیں ہیں صرف کفن بدلے گئے ہیں، وہ انہیں دیکھتے ہوئے سوچتا۔ وہ خبر کب چھپے گی۔

ایک دن دفتر میں کسی نے ذکر کیا کہ اگر ڈش کے ساتھ ایک ایل این بی لگا لی جائے تو کچھ چینل اور آ جاتے ہیں، ان میں سے کچھ نیوز کے بھی ہیں۔ پہلی تاریخ کو ناپنے پر بہت جبر کر کے اس نے کچھ پیسے بچا لیے اور ایک نئی ایل این بی لگوا لی۔

چینل دگنے ہو گئے، بچے بڑے خوش ہوئے لیکن اس کو اب بھی کچھ نہ ملا۔ ان نئے نیوز چینلوں پر بھی وہی پرانی خبریں تھیں، وہی پرانے چہرے، صرف کبھی ماسک بدل جاتا۔

وہ کچھ مایوس سا ہو گیا، اب وہ ساٹھ کے قریب پہنچنے والا تھا کچھ دنوں بعد ریٹائر ہو جائے گا، بس زندگی تو کولہو کے بیل کی طرح ہی گزر گئی۔ وہ ایک تبدیلی، ایک نئی خبر کی تمنا ایک حسرت ہی بنتی جا رہی تھی۔ اور کئی بار اخبار پڑھ کر، کئی نیوز چینل سن کر بھی وہ خبر نہ ملتی، تو کیا وہ خبر اسے کبھی نہ ملے گی۔ شاید وہ خبر کسی ایسے چینل پر ہو جو اس کی ڈش پر نہیں آتا۔ اب گھومنے والی ڈشیں آ گئی تھیں اور بتانے والے بتاتے تھے کہ اس پر اتنے چینل ہیں کہ گنتی کرنا مشکل ہے۔ وہ سوچتا ان میں سے بے شمار نیوز چینل بھی ہوں گے۔ شاید اس کی خبر، جس کا وہ منتظر ہے ان میں سے کسی پر آ جائے۔ یہ سارے چینل اور اخبار تو بکے ہوئے ہیں، وہی بتاتے اور چھاپتے ہیں جو انہیں بتایا جاتا ہے۔ بڑے غیر جانب دار، جن کے بارے میں خوش فہمی تھی کہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، ایک ہی طرح کے تھے، صرف لفظوں کا ہیر پھیر تھا۔

"سب ایک ہی ہیں" وہ سوچتا۔ "لگتا ہے کہ انہیں کنٹرول کرنے والے اندر سے ایک ہی ہیں۔"

شاید گھومنے والے ڈش پر کوئی ایسا چینل ہو جو سچ بولتا ہو اور شاید وہاں سے.......... --- ریٹائرمنٹ کے پیسے ملے تو اس نے کسی کو بتائے بغیر ایک گھومنے والی ڈش لگوا لی۔ واقعی اس پر اتنے چینل تھے کہ گنتی مشکل تھی۔ ان میں بے شمار نیوز چینل بھی تھے۔ کئی دن تو انہیں تلاش کرتے لگ گئے۔ اب وہ یوں بھی فارغ تھا۔ بچے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے، بیوی باورچی خانے میں گھس جاتی اور وہ

ریموٹ اٹھا کر چینل گھماتا رہتا۔ گھماتے گھماتے انگلیاں شل ہو گئیں۔ تلاش کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں لیکن وہ خبر نہ سنی جا سکی نہ پڑھی جا سکی۔ اب اسے ہلکی ہلکی سانس کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ زیادہ دیر تو بیٹھا نہ جا سکتا، نیم دراز کیفیت میں ایک آدھ اخبار دیکھ لیتا۔ اسٹال تک جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ٹی وی بھی زیادہ دیر نہ دیکھا جا سکتا۔ بس جلدی جلدی چینل بدلتا رہتا۔ شام کو بچے ریموٹ سنبھال لیتے اور وہ اس منظر سے باہر ہو جاتا۔

ایک دن اچانک سانس کی تکلیف بڑھ گئی۔ ریموٹ اس کے ہاتھوں ہی میں رہ گیا اور آنکھیں چپکے سے بند ہو گئیں۔ اس کے بیٹے نے اپنے کسی دوست کو کہہ کر اخبار میں خبر لگوا دی۔ وفاتیات کے کالم میں سب سے نیچے تین سطری ایک خبر چھپی:

''عام آدمی ابن عام آدمی کل رات وفات پا گیا۔ نمازِ جنازہ میں بہت سے عام آدمیوں نے شرکت کی۔ رسمِ قل کل سہ پہر ادا کی جائے گی۔''

معلوم نہیں اب وہ یہ خبر پڑھ سکتا تھا کہ نہیں؟

~~~~~~~
~~~~~~~

شبِ مراقبہ کے اعترافات کی کہانیاں

(۱)

مرشد سے ملنے سے پہلے، معمول سے زیادہ کچھ جاننے کی خواہش ہی نہ تھی، اور نہ شاید ضرورت کہ کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے کی کیفیت میں بسر ہو رہی تھی۔ معمول سے زیادہ کچھ جاننے کی لت اسے اس درویش سے پڑی جو بڑے پارک کے ایک تالاب کنارے بیٹھا پانی میں کنکریاں پھینکتا رہتا تھا۔ سیر کرتے ہوئے وہ اکثر وہاں رک جاتا اور غیر ارادی طور پر کنکریاں پھینکنے کے عمل کو دیکھتا، سمجھ نہ آتی کہ درویش کیا کر رہا ہے، آخر ایک دن پوچھ ہی بیٹھا۔

درویش مسکرایا اور بولا، ''ہر کنکری پانی کی ایک نئی سطح بناتی ہے۔''

اسے کچھ سمجھ نہ آیا...... ''تو پھر؟''

درویش نے اسے گھورا...... ''جاؤ اپنا کام کرو، یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔''

اسے غصہ تو آیا لیکن کچھ کیے بغیر آگے نکل گیا۔

سیر کرتے تالاب کے پاس پہنچتا تو رکنے کو جی چاہتا لیکن درویش کے غصے سے ڈرتے آگے بڑھ جاتا، دو تین دن تذبذب میں گزرے، پھر وہ ٹھہر گیا۔

''میں سمجھنا چاہتا ہوں۔''

درویش مسکرایا...... ''اب تم راستے پر آ گئے ہو۔ طلب بنیادی کنجی ہے جس سے سارے دروازے کھلتے ہیں۔''

''میں یہ دروازے کھولنا چاہتا ہوں، ہر نئی سطح کو جاننا چاہتا ہوں۔''

درویش بولا ...... ''جاؤ مرشد کو تلاش کرو۔''

''مرشد'' اس نے پوچھا ...... ''وہ کہاں ملے گا؟''

''تمہارے آس پاس'' درویش نے کہا ...... ''نظریں کھلی رکھو''

مرشد اسی شام مل گیا۔ لمبی سیر کے بعد ذرا ستانے کو وہ سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ مرشد ساتھ آ بیٹھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میں تو تمہیں جانتا ہوں۔'' اس نے مرشد سے کہا۔

مرشد مسکرایا ...... ''جانتے تو ہم بہت کچھ ہوتے ہیں، اصل چیز تو اس کا اقرار ہے۔''

''اقرار......!''

''ہاں اقرار'' مرشد نے کہا ...... ''پہلے نفی پھر اثبات۔ اس کے بغیر اقرار نہیں ہو سکتا۔''

''اور اقرار کے لیے'' اس نے اپنے آپ سے کہا ...... ''پہلے محبت اور پھر ڈر پیدا کرنا چاہیے۔''

مرشد مسکرایا ...... ''یہ وہ مقام ہے جہاں خوشی حدّت پیدا کرتی ہے اور حدّت ہی راہ سلوک کا سب سے بڑا پتھر ہے۔''

اس نے کہا ...... ''تو اس پتھر کو ہٹانا چاہیے۔''

پتھر نے غار کا منہ بند کیا ہوا تھا، وہ اندر اترے تو اوّل اوّل اندھیرے نے انہیں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سیلن زدہ اندھیرا ان کے وجودوں پر رینگنے لگا۔ دونوں ہاتھ پیر مارتے آگے نکل آئے، اب سرمئی دھند کا علاقہ شروع ہوا۔

مرشد بولا ...... ''آگے بڑھنے سے پہلے مردود بننا پڑے گا۔''

اس نے پوچھا ...... ''کس کا مردود؟''
مرشد نے کہا ...... ''اپنے آپ کا۔ اور جب تم خود کو رد کر دو گے تو رد عین قبول کے مقام پر پہنچ جاؤ گے۔''
سرمئی دھند سے گزرتے اس کا وجود بھی سرمئی ہو گیا۔ سارے متعلقات دور کہیں پیچھے رہ گئے۔
اس نے سوچا ...... ''میرا وثیقہ ہو گیا۔''
مرشد نے اس کی سوچ سن لی اور بولا ...... ''تمہارے باطن نے اس وثیقہ پر شہادت دی۔''
اور یہیں سے زا (بھید) کی کیفیت شروع ہوئی جو ایک دائرہ کی طرح تھی۔
وہ دائرے کے گردا گرد گھوما، گھومتا رہا، معلوم نہیں لمحہ بیتا یا صدیاں گزر گئیں، لیکن اندر داخل ہونے کا راستہ نہ ملا۔ اس نے مرشد سے کہا ......
''اس دائرے کا کوئی دروازہ نہیں اور اس میں جو نقطۂ وسطانی ہے، میں اس تک نہیں پہنچ سکتا۔''
مرشد بولا ...... ''اس اسرار کو دائرے کے ارد گرد رہ کر دیکھو ...... یہ نہ دائرے سے باہر ہے نہ اس کے اندر۔''
''کس طرح''
''اس لیے کہ ......'' مرشد نے کہا ...... ''نقطہ کوئی طول، کوئی عرض، کوئی عمق نہیں رکھتا۔''
''تو لاشے کو میں کیسے دیکھوں'' وہ بے چارگی سے بولا۔
مرشد ہنسا ...... ''دونوں نقطوں کے درمیان خط کھینچ لو۔''

''دوسرا کون؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک تم، دوسرا وہ'' ...... ''خط کھینچ لو گے تو تمام شکلیں نقطے ہی سے وجود میں آئیں گی۔''

''شاید ٹھیک ہی کہتے ہو'' وہ بڑبڑایا .... ''نقطہ ہی موجود ہے اور نقطہ ہی غائب۔''

سرمئی دھند میں اُڑتے اُڑتے جب پَر ٹوٹے تو وہ چلّایا ...... ''مرشد میرے پَر ٹوٹ رہے ہیں۔''

مرشد نے کہا ...... ''مبارک ہو ...... یہاں سے تیری بقاء کا سفر شروع ہوا۔''

آہستہ آہستہ وہ نیچے بیٹھنے لگا، اور آہستگی سے اس کے پاؤں نے زمین کو چھوا۔

''یہ بھی عجیب بات ہے۔'' اس نے سوچا ...... ''زمین پر تھا تو اُڑنے کی خواہش بے چین رکھتی تھی، اُڑا ہوں تو زمین کھینچ لیتی ہے۔''

''یہی حقیقت ہے۔'' مرشد مسکرایا۔

یہ سفر شاید ایک ہزار ایک راتوں کا تھا، یا صرف ایک رات کا، مرشد نے جانے سے پہلے کہا ......

''جب کسی کی تعریف کرتے جھجک نہ آئے اور مخالفت کرتے دیر تک ملال رہے تو سمجھ تم زندہ ہو، کیونکہ ذات صفات کے پردے ہی میں اپنا اظہار کرتی ہے۔''

اس نے کہا ...... ''میں نے اسے دیکھا، سمجھا، لیکن میرے پاس اس کا کوئی نام نہیں۔''

مرشد نے جواب دیا...... ''بس وہ ایک قوت ہے، چلو تم اسے انرجی کہہ لو۔''

یہ کہہ کر مرشد نے پَر پھیلائے اور اُڑتا ہوا سرمئی دھند میں غائب ہو گیا۔

صبح اٹھ کر اس نے سوچا ...... واقعی وہ ایک انرجی ہے، اس عظیم کمپیوٹر کا خالق جس میں کئی سوفٹ ویئر کام کر رہے ہیں، ان گنت چینل ہیں، جن پر کئی سی ڈیز چل رہی ہیں۔ ایک سی ڈی میں بھی ہوں، جس کا اپنا طے شدہ وقت اور پروگرام ہے، اگر کوئی بریک ڈاؤن نہ ہوا تو گھنٹے، منٹ، سیکنڈ تک متعین ہیں، ایک کلک اور پروگرام ختم ...... سکرین پر چترے مترے ...... پھر کون جانے یہ سی ڈی دوبارہ آن ہو جائے اور کسی دوسرے چینل پر چل پڑے ...... کون جانے؟

~~~~~~~
~~~~~~~

(۲)

اِن دنوں مرشد کا کچھ پتہ نہ چلتا کہ کب آیا، کب گیا۔ پلک جھپکنے میں باتیں کرتے کرتے اُڈاری ماری اور یہ جا وہ جا، آنا ایسا کہ چلتے چلتے، بیٹھے بیٹھے احساس ہوتا کہ کہ ساتھ ہے۔ تنہائی کے دنوں میں وہی معمول تھا کہ دفتر سے آ کر کچھ آرام، پھر شام کی سیر، بڑے پارک کے واکنگ ٹریک کے دو چکر لگا کر، کنول کے تالاب کے ساتھ چلتے اس ویران پتھر کی سِل پر بیٹھنا، جہاں کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا۔ ان دنوں یہی تنہائی تھی، سیر کرتے ہوئے بھی دفتر اور گھر ذہن پر سوار رہتے، الجھن سی ہوتی کہ مرشد کے ہوتے کیسی کیسی باتیں ہوتی تھیں۔ کم از کم سیر کے دوران تو وہ پَر پھیلا کر اُڑ سکتا تھا، سرمئی دھند کو چھوتا کچھ جاننے کی سعی کرتا، سوال کرتا، کچھ کے جواب ملتے، کچھ کے نہ ملتے لیکن اُڑان کا مزہ تو اپنی جگہ تھا، لیکن اب کئی دنوں سے مرشد غائب تھا، وہ ٹریک کے دو چکر لگا کر حسب معمول کنول کے تالاب سے ہوتا، پتھر کی سِل پر آ بیٹھا۔ دفعتہً احساس ہوا کہ مرشد ساتھ بیٹھا ہے۔

’’کہاں چلے گئے تھے؟‘‘ اس کی آواز میں شکایت تھی۔

’’میں کہاں گیا تھا، یہیں تھا۔‘‘ مرشد مسکرایا۔

’’یہاں کہاں ...... مجھے تو نظر نہیں آئے۔‘‘

’’ہونے کے لیے دکھائی دینا ہی ضروری نہیں۔‘‘

’’تو ......‘‘

’’صرف دیکھا نہ کرو، محسوس بھی کیا کرو۔‘‘

''میری تو نظر ہی کمزور ہوگئی ہے۔'' اس نے عینک صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا...... ''کچھ سمجھ نہیں آتا، نظر اتنی تیزی سے کیوں گر رہی ہے۔''

''موتیا تو نہیں اُتر رہا؟'' اس کے ساتھی نے کہا۔

''شاید......''

''تو فوراً ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

ڈاکٹر نے مختلف زاویوں سے اس کی آنکھوں کو ٹٹول کر، دبا کر دیکھا، ٹارچ کی روشنی میں اس کی پتلیوں کا جائزہ لیا اور بولا ...... ''تقریباً چھ سات مہینے لگیں گے موتیا براؤن ہونے میں، اس دوران آپ کی نظر مسلسل گرتی رہے گی۔''

مرشد ہنسا...... ''چلو اس دوران تم نظر کی بجائے کچھ عقل کا استعمال بھی کرلو۔''

''لیکن تم ہی تو کہتے ہو کہ عقل اس کے راستے کی دیوار ہے۔''

''میں دنیاوی عقل کی بات نہیں کر رہا۔'' مرشد بولا...... ''شعور کی بات کر رہا ہوں اور شعور کا تعلق محسوس کرنے سے بھی ہے۔''

اس نے جواب دیا ...... ''میں تو اسے ہمیشہ ہی محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہی کبھی قریب آتا ہے، کبھی دور، بہت دور چلا جاتا ہے۔''

مرشد بولا ...... ''اس کا دور جانا بھی ایک ادا ہے۔''

''مجھے تو اس کی اداؤں نے مار دیا۔'' وہ ہنسا۔

''عشق میں مرنا تو پڑتا ہی ہے۔'' مرشد بھی ہنسا۔

دونوں چلتے ہوئے کنول کے تالاب کنارے دوسری طرف آ گئے جہاں سے شہر کی جگمگاتی روشنیاں رقص کرتی دکھائی دے رہی ہیں، نیم اندھیرے سے روشنیوں کا رقص عجیب لطف دے رہا تھا۔

مرشد کہنے لگا ...... ''اندھیرے اور روشنی میں کتنا باریک سا فرق ہے لیکن ہمیں کتنا بُعد محسوس ہوتا ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا ...... ''شاید ایسا ہی زندگی اور موت میں بھی ہے۔''

''ایک لمحہ کبھی کبھی صدیاں بن جاتا ہے۔''

''کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

مرشد بولا ...... ''ایک شخص قبرستان سے گزر رہا تھا۔ پاؤں پھسلا تو ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں جا گرا۔ چند لمحوں بعد نکلا تو معلوم ہوا ہزار سال بیت چکے ہیں۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، اپنے طور پر سوچا ایک لمحہ اگر ہزار سال میں بدل سکتا ہے تو فنا بقا میں کتنی دیر میں تبدیل ہو گی۔ مرشد نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا ...... ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''فنا اگر بقا ہے تو پھر بقا کیا ہے؟''

''صرف لفظوں کا فرق ہے۔''

اس نے پوچھا ...... ''وقت، ذات ہے یا صفت؟''

مرشد نے کہا ...... ''صفت، اس لیے کہ ذات کسی میں بھی منتقل نہیں ہوتی، ہاں صفات کا کچھ حصہ عطا ہو جاتا ہے۔''

اس نے دعا مانگی ...... ''اے ذات! مجھے اپنی اس صفت کا کچھ حصہ عطا کر کہ میں دوسری طرف جا کر واپس آ سکوں۔''

مرشد ہنسا ...... ''دوسری طرف جانا بھی چاہتے ہو اور واپسی کی دعا بھی مانگتے ہو۔''

”ہاں...... “اس نے کہا” میں سمندر کی تہہ میں اترنا چاہتا ہوں، مگر وہاں رہنا نہیں چاہتا کہ مجھے اس کی وسعتوں سے ڈر لگتا ہے۔“

مرشد نے تبسم کیا...... ”اپنے وجود کی نفی سے ڈرتے ہو۔“

”وجود کی نفی سے نہیں، اپنے نہ ہونے کے احساس کا خوف ہے، میرے اپنے ہونے کا احساس نہ رہا تو پھر جاننا اور نہ جاننا بے معنی ہے۔“

مرشد بولا...... ”آؤ اس نقطہ کے گرد دائرہ بناتے ہیں۔“

انہوں نے مل کر دائرہ کھینچا، پھر اس دائرے کے گرداگرد کئی دائرے بنائے، بنتے گئے۔ بن گئے تو وہ کہنے لگا...... ”دائرے تو ہم نے بنا لیے، اندر جانے کا راستہ کہاں ہے؟“

اندر جانے کا راستہ کوئی نہیں تھا، تو کیا ہمارا مقدر دائرے سے سر ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جانا ہے۔

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مرشد حسبِ عادت اُڈاری مار کب کا جا چکا تھا۔

کنول کے تالاب کنارے پتھر کی سِل پر بیٹھے اندھیرا گہرا ہو گیا۔ بیوی بھی اپنا چکر لگا کر آ گئی اور بولی...... ”چلیں، آج تو بہت دیر ہو گئی۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

(۳)

بڑی ہی پریشانی کے دن تھے، مرشد کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کی میز سے ایک اہم فائل گم ہو گئی تھی، انکوائری جاری تھی اور اگر وہ قصوروار ثابت ہو جاتا تو نوکری تو جاتی ہی اور بہت کچھ بھی بھگتنا پڑتا۔ ایسے میں مرشد کی ضرورت تھی، وہ ہر شام کنول تالاب کنارے پتھر کی سِل پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا۔ سیر تو برائے نام ہی تھی، ایک چکر بھی پورا نہ ہوتا اور اکتاہٹ ہونے لگتی۔

"یہ اعتبار بھی عجب شے ہے..... " بیٹھے بیٹھے خیال آیا۔ "میں اتنی جلدی لوگوں پر اعتبار کر بیٹھتا ہوں۔"

"یہی تو سادگی ہے اور سادگی اسے بہت پسند ہے۔"

آواز سن کر وہ چونکا۔ مرشد جانے کب کا آ بیٹھا تھا۔

"کدھر چلے گئے تھے ......" اس نے کہا ......"میں اِن دنوں......"

"مجھے معلوم ہے" مرشد بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تمہارے اندر بھی ہوں اور باہر بھی۔" مرشد مسکرایا۔

"تو میں کیا کروں......"

"انتظار" مرشد نے کہا ......"انتظار میں مزہ بھی ہے اور دکھ بھی، اور تم جانتے ہو دکھ تمہارا راستہ ہے۔"

"لیکن یہ راستہ آگے بند ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

”کوئی راستہ بند نہیں ہوتا۔“

لیکن فی الحال تو راستہ بند ہی تھا، آگے بھیانک تاریکی تھی، کچھ سمجھ نہ آتا کہ کون دوست ہے، کون دشمن، دن بھر لوگ اس کے سامنے آ کر اس کی دیانت کی تعریفیں کرتے اور دروازے سے نکلتے ہی اس کے کئی ناکردہ گناہوں کی سزا بھی دیتے۔ اس نے سوچا: ”یہ دنیا بھی عجب ہے، ہر شے دو چہرے رکھتی ہے۔“

”لیکن اس کا کوئی چہرہ نہیں ، اس لیے دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ مرشد بولا۔

”پر فاصلہ تو ہے“

”فاصلہ طلب کا امتحان ہے۔“

امتحان میں مزاج کو اعتدال پر رکھنا کتنا مشکل ہے، اس کا خوب اندازہ ہو رہا تھا۔ بیوی بچے الگ پریشان۔ اس کے چڑچڑے پن سے پریشان بیوی بار بار کہتی ......

”جو ہونا ہے ہو جائے گا کیوں اتنا کڑھتے ہو۔“

”کڑھتا اس لیے ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا، آخر یہ کس بات کی سزا ہے۔“

مرشد نے جو دیر سے چپ تھا، سکوت توڑا ...... ”یہ ایک کیفیت ہے اور کیفیت کا عرصہ برزخ کی طرح ہے۔“

”لیکن برزخ میں زیادہ عرصہ نہیں گزارا جا سکتا۔“ اس نے ناخن کریدتے ہوئے کہا۔

”تو پھر نکلو یہاں سے، آگ کی خبر لائیں۔“

مرشد آگے آگے، وہ پیچھے پیچھے اس لمبے سفر پر نکل پڑے، جسے اس درخت پر ختم ہونا تھا، جو بولا تھا، لیکن وہ کیا بولتا، بولنے والا تو کوئی اور تھا، سننے والا بھی کوئی دوسرا نہیں تھا، وہ

خود تھا۔ جو واصف ہے وہی موصوف ہے، تو پھر میں کیا اور تو کیا ...... سفر کے معنی کیا؟

اس نے کہا ...... ''مرشد چلو واپس چلیں، ہم تو اپنی ذات کے دائرے ہی میں پھر رہے ہیں۔''

مرشد ہنسا ...... ''لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہم دائرے کی لکیر کے ساتھ ساتھ پھر رہے ہیں، مرکزہ کے ساتھ نہیں''

اس نے پوچھا ...... ''تو مرکزہ تک کیسے پہنچیں گے۔''

''اسباب سے نظر اٹھاؤ اور سبب پر مرکوز کرو تو مرکزہ خود بخود سامنے آ جائے گا۔''

نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے وہی کنول کا تالاب تھا، شام زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی اور ہلکی تھاپ پر رقص کرتا اندھیرا چاروں طرف پھیل رہا تھا، وہ اور مرشد چپ چاپ بیٹھے اپنے اپنے دائرے میں مرکزہ کو تلاش کر رہے تھے کہ اس کی بیوی نیم دوڑتی، ہانپتی آئی:

''تم یہاں بیٹھے ہو، میں چاروں طرف تلاش کر آئی۔''

''خیر ہے ...... کیا ہوا؟''

'''ابھی ابھی ...... صاحب کا فون آیا ہے کہ ...... فائل کا پتہ چل گیا۔''

کیا......؟'' وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''فائل تمہارے کلرک نے چُرائی تھی ...... کمپنی والوں سے رشوت لے کر ...... وہ مان بھی گیا ہے۔'' بیوی نے پھولی سانسوں میں بات کو ٹکڑے کر دیا۔

وہ ایک لمبی سانس لے کر دوبارہ پتھر کی سِل پر بیٹھ گیا۔ مرشد حسبِ عادت اُڈاری مار کبھی کا جا چکا تھا۔ اسے خیال آیا:

''یہ بھی خوب ہے ...... یہ فائل نہ گُمتی تو میں اتنا سفر کیسے کرتا ...... مرشد ٹھیک ہی کہتا ہے ...... جو فکر ہے، وہی ذکر ہے۔''

~~~~~~~
~~~~~~~

(۴)

عجب خوشبو بھرے دن تھے۔ پیلے پھول نئے ہمکتے ہوئے موسم کی آمد آمد کی خبریں پھیلا رہے تھے، وہ سیر کرتے ہوئے جھوم جھوم جاتا کہ یہ دن خوشبو کے دن تھے۔ اس کی خوشبو کی حِس سال میں ہفتہ دس دن کے لیے ہی بیدار ہوتی تھی، ورنہ سارا سال اسے خوشبو بدبو سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اچانک ہی کسی کھلکھلاتی صبح شیو کرتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ شیونگ کریم میں تو خوشبو بھی ہے۔ اس پر وہ وجدانی کیفیت میں آ جاتا۔ صابن کو اٹھا کر سونگھتا، شیونگ کریم کو تھپتھپا کر چہرے پر ملتا، بعد میں کریم بھی لگاتا، خوشبو کا اسپرے کرتا۔ اس کے ملنے جلنے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ خوشبو کے دن ہیں۔ سب سے پہلے تو بیوی ہنستی ...... ''لگتا ہے تمہاری ناک کھل گئی ہے۔''

وہ جھومتے ہوئے کہتا ...... ''ہر طرف خوشبو ہی خوشبو ہے۔''

لیکن خوشبو کا یہ رقص چند دن ہی رہتا، پھر کسی دن اچانک اسے احساس ہوتا کہ شیونگ کریم میں خوشبو نہیں، صابن خوشبو سے خالی ہے ...... بس پھر وہی لمبا عرصہ نہ خوشبو نہ بدبو۔ خوشبوؤں کا عرصہ مختصر سا ہوتا لیکن سال بھر کی کوفت دور کر جاتا، ذہن میں نئی نئی باتیں آتیں۔ مرشد سے لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔

یہ دن ...... رقص کرتے دن، خوشبوؤں کے نام تھے، لیکن مرشد حسبِ معمول غائب۔ لمبی سیر کر کے آس پاس کے پھولوں کی خوشبو چکھتے، وہ تالاب کنارے پڑی سِل پر آ بیٹھا اور تیرتے کنولوں کو دیکھنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ چونکا۔ مرشد چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سوچ رہا ہوں ......'' وہ بولا...... ''صاف پانی میں تو سبھی غوطہ لگاتے ہیں، کیوں نہ اس تالاب میں جھانکا جائے۔''

مرشد مسکرایا ...... ''کنول کی تہہ دیکھنا چاہتے ہو!''

''ہاں'' وہ بڑبڑایا ...... ''میرے بچپن میں کنول کی جڑوں میں پایا جانے والا ایک پھل بکا کرتا تھا، جسے کول ڈوڈے کہتے تھے۔''

''وہ تو اب بھی موجود ہیں'' مرشد بولا ...... ''لیکن اب لوگوں کی پسند بدل گئی ہے، وہ ایسی چیزیں نہیں کھاتے۔''

''ٹھیک کہتے ہو ...... آج صبح میں نے چائے میں روٹی بھگو کر کھائی تو میرے بچے حیرت سے دیکھنے لگے اور ماں سے پوچھنے لگے کہ ابّو یہ کیا گند کر رہے ہیں۔''

مرشد ہنسا ...... ''تمہاری بیوی نے کہا ہو گا کہ اپنا پینڈو پن نہیں بھولتے۔''

''یہی کہا تھا......'' وہ بھی ہنسا ...... ''میرا جی چاہتا ہے کنول کی جڑوں سے کول ڈوڈے نکالوں۔''

''پھسل کر اندر جا گرے تو پھر وہیں رہو گے۔'' مرشد بولا۔

''پھر کیا ...... یہ تجربہ بھی سہی۔''

''اب نئے نئے تجربے کرنے کی تمہاری عمر نہیں ہے۔'' بیوی غصے سے بولی۔

''ہر نئے تجربے کی گود میں ایک نیا ہمکتا ہوا خیال ہوتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ لیکن چپ رہا۔ بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی تو وہ خیالوں کی پگڈنڈی

پگڈنڈی دور تک پھیلے مرغزاروں میں پہنچ گیا۔ خوشبوئیں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کر رہی تھیں۔ ہوا گِداں بجاتی، ہنس ہنس کر دُہری ہوئی جا رہی تھی۔

مرشد بولا ...... ''اس کا ہونا بھی ایسے ہی ہے جیسے پھول میں خوشبو۔''

اس نے کچھ دیر سوچا ...... ''تو پھر اس کے ساتھ چلنے کے لیے ہَوا بننا ضروری ہے۔''

دونوں ہَوا بن گئے اور اُڑتے پھرے، ٹہنی ٹہنی، پھول پھول، دیر تک اُڑنے کے بعد رکے تو دیکھا کہ ایک شخص اشاروں سے کچھ کر رہا ہے۔

پوچھا ...... ''اے شخص کیا کر رہا ہے۔''

وہ بولا ...... ''دیکھتے نہیں میں اس سے گفتگو کر رہا ہوں۔''

کہا ...... ''یہ کیسی گفتگو ہے جس میں لفظ نہیں۔''

اس نے جواب دیا ...... ''لفظ گمراہ کرتے ہیں اور درمیان میں ایک پردہ کھینچ دیتے ہیں، میں نے عرصہ ہوا لفظ ترک کر دیے اب اس سے گفتگو کرنے کے لیے مجھے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے مرشد کی طرف دیکھا۔

مرشد نے کہا ...... ''یہ شخص اگلے پڑاؤ پر ہے۔''

وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر مڑے۔

اس نے پوچھا ...... ''یہ میرے ساتھ کیا ظلم ہے کہ سال میں، صرف چند دن میرے ہیں۔''

مرشد بولا ...... ''اسے بھی غنیمت سمجھو کہ چند دن تو تمہارے ہیں۔''

اس نے جھنجھلا کر کہا ...... ''یہ میری بے بسی ہے۔''

مرشد بولا ...... ''بے بسی بھی ایک کیفیت ہے۔''

اسے بڑا غصہ آیا ...... ''ہر چیز ہی ایک کیفیت ہے تو میں کہاں ہوں؟''

''کہیں بھی نہیں۔'' مرشد ہنسا۔

''کیوں نہیں؟''

''یہی تو سفر کا آغاز ہے، اس ''کیوں'' کو تلاش کرو، جانو اور سمجھو۔''

وہ جھنجھلایا ہوا تھا، بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا ...... بولا ''خوشبوئیں مدھم ہو رہی ہیں، پھر وہی ایک طویل خشک موسم۔''

مرشد نے کہا ...... ''آؤ کنول کے تالاب پر چلیں۔''

دونوں پتھر کی سِل پر بیٹھ گئے۔ تادیر چپ رہے پھر مرشد نے کہا ...... ''پھول تالاب کی سطح پر کھلے ہیں اور نیچے کائی اور سڑانڈ ہے، پھول کی قسمت یہی کچھ ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو'' وہ بڑبڑایا اور چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

(۵)

خزاں کی آمد آمد تھی اور بہار چپکے چپکے اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ درختوں سے گرتے اِکا دُکا پتے پیروں کے نیچے چرمرانے لگے تھے۔ کنول کا تالاب خالی خالی دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کہیں ایک آدھ پھول، مرجھانے کی تیاریوں میں تھا۔ تالاب کی سطح پر سبز کائی کا مخملی فرش بچھتا جا رہا تھا۔ خوشبوؤں کو گئے عرصہ ہو چلا تھا۔ مرشد حسبِ عادت کئی دن سے غائب تھا۔ تالاب کنارے پڑی سِل پر بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا، مرشد ہوتا تو ان بدلتے موسموں کی کچھ خبر لیتے، کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے، اور یہ عروج و زوال کیا ہے، خزاں کیا ہے، بہار کیا ہے؟

ابھی اس کی سوچ کا دھارا کسی سمندر کی تلاش ہی میں تھا کہ مرشد جو جانے کب سے خاموشی سے پاس آ بیٹھا تھا، بولا ...... ''سفر کرنا تو اتنا مشکل نہیں، لیکن سفر کی عطا کے لیے جس ظرف کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤ گے۔''

وہ چونکا ...... ''تم کب آئے؟''

''میں گیا ہی کہاں تھا۔'' مرشد نے تبسم کیا۔

اس نے بحث نہیں کی، کہنے لگا ...... ''سفر تو شروع کریں، ظرف خود ہی پیدا ہو جائے گا۔''

دونوں اَن دیکھے سفر پر نکل پڑے۔

دریا کنارے دیکھا کہ ایک شخص، ایک ٹانگ پر کھڑا وظیفہ کر رہا ہے۔

مرشد بولا ...... ''یہ تلاش کم اور دکھاوا زیادہ ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا ...... ''جاننے کی سچی طلب ہو تو ان کرتبوں کی ضرورت نہیں۔''

ان کی باتیں سن کر اس شخص نے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور غصہ سے بولا ......''بغیر جانے سمجھے اظہار بے وقوفی کی دلیل ہے، اور بے وقوف کو کبھی کچھ نہیں ملتا۔''

وہ گھبرا گیا ...... اور معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا ......''آپ سچ کہتے ہیں، کون جانتا ہے کہ کیا دکھاوا ہے اور کیا حقیقت!''

مرشد کچھ نہ بولا، چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا، جب دونوں کچھ آگے نکل آئے تو کہنے لگا ......''جو دکھائی دیتا ہے، ضروری نہیں وہی سچ ہو۔''

''تو پھر سچ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''چلو اسے تلاش کریں۔'' مرشد نے جواب دیا۔

اور دونوں گھنے جنگل میں اتر گئے۔

جنگل گھنا، نیم تاریک اور دیکھنے میں سنسان تھا، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے، چیزیں بولنے لگیں، پتے اشارے کرنے لگے، درختوں نے سرگوشیاں کیں اور چرند پرند گھنی شاخوں، جھاڑیوں اور اپنی اپنی کھوؤں سے نکلنے لگے۔

''جنگل بھی بولتے ہیں۔'' مرشد بولا ......''اگر انہیں احساس ہو کہ سننے والا موجود ہے۔''

اسے ان چار طیور کی کہانی یاد آئی جو سیمرغ کو تلاش کرنے نکلے تھے، اور طویل سفر کی صعوبتیں سہتے جب آئینۂ صفات کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آئینۂ صفات میں انہی کا عکس موجود ہے۔ اس نے مرشد سے کہا:

"جنگل تو ہمارے اندر بھی موجود ہے اور سرگوشی بھی کرتا ہے مگر انہی کے لیے
جو اس کی آواز سننا چاہتے ہیں۔"

"سننے کی خواہش، زندہ ہونے کی دلیل ہے۔" مرشد نے کہا ...... "اور زندہ
وہی ہے جسے اپنے ہونے کا احساس ہے۔"

جنگل کے بیچوں بیچ ایک تالاب تھا، جس کے آدھے حصے پر کائی کا سبز مخملی
فرش بچھا ہوا تھا، باقی کے آدھے حصے میں پانی شفاف تھا۔ اس نے مرشد سے پوچھا:

"یہ کیا ماجرا ہے کہ آدھا تالاب اور طرح کا ہے اور آدھا اور طرح کا۔"

مرشد ہنسا ...... "تالاب ایک ہی ہے، یہ صرف ہمارے دیکھنے کا انداز ہے
...... کیا تم نہیں جانتے کہ سچ آدھی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔"

اس نے سر ہلایا ...... "واقعی صورت اشیاء معلوم ہے، حقیقتِ اشیاء مجہول ہے،
اور یہی مقامِ تعجب ہے۔"

"تعجب بھی ایک نعمت ہے" مرشد بولا ...... "تعجب ختم ہو جائے تو آدمی پتھر
ہو جاتا ہے۔"

وہ آگے بڑھے کہ مقام عجب کے بعد اب مقام طلب آتا تھا اور مقام طلب
سے پہلے آگ روشن تھی، شعلے لمبی لمبی زبانیں نکالے شُوں شُوں کر رہے تھے
کہ اس آگ میں جل کر ہی خرمنِ ہستی کو خاک ہونا تھا کہ صفاتِ نفسانیہ
میں سے کوئی صفت باقی نہ رہے ...... اس کے بغیر وصال ممکن نہ تھا۔

مرشد نے کہا ...... "آگ عشق ہے، جل کر ہی طلب ختم ہوتی ہے اور طالب،
مطلوب اور طلب کی تثلیث باقی نہیں رہتی۔"

وہ جھجک گیا ...... "جلنا اتنا آسان نہیں۔"

مرشد ہنسا ...... ''تطہیر قلب بھی چاہتے ہو اور جلنے سے بھی ڈرتے ہو ......
تمہارے اندر سے ابھی دنیا نہیں نکلی۔''
اسے بیوی یاد آئی۔ کھلکھلاتے بچوں کی کلکاریوں نے کانوں میں رس گھولا،
بولا ...... '' آگ حسی بھی ہے اور معنوی بھی، میں حِس تک ہی محدود رہنا
چاہتا ہوں۔''
مرشد ہنسا، خوب ہنسا ...... '' تم اس غلام کی مانند ہو جو زر مکاتیب ادا کر چکا،
مگر صرف ایک درہم ادا کرنا باقی ہے کہ آزادی ملے، مگر اسی ایک درہم کی
ادائیگی سے ڈر رہا ہے۔''
اس نے اثبات میں سر ہلایا ...... ''صفاتِ نفسانیہ میں سے ایک صفت بھی باقی
رہے تو آدمی اسی صفت کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔''
مرشد نے کوئی جواب نہ دیا، اور بڑے وقار سے قدم قدم چلتا آگے کے
دائرے میں داخل ہوگیا، وہ باہر بیٹھا دیر تک اس کا انتظا کرتا رہا، پھر خاموشی سے اٹھا
اور اپنے آپ سے کہنے لگا ...... ''اعلیٰ شہود یہی ہے کہ شاہد و مشہود کی دوئی مٹ جائے
اور اسی کی آنکھیں، اسی کے جلوے، لیکن یہ وہ مقام ہے جو میرے نصیبوں میں نہیں،
مرشد نے اسے پا لیا۔''

اس شام سیر کے بعد وہ دیر تک تالاب کنارے سِل پر بیٹھا، چپ چاپ،
تالاب کو دیکھتا رہا، کنول مرجھا گئے تھے اور سبز کائی آہستہ آہستہ پورے تالاب پر بچھتی
جا رہی تھی۔

~~~~~~~
~~~~~~~

پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دِن

صبح شیو کرتے ہوئے دفعتۃً اسے خیال آیا کہ آج پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دن ہے۔ کچھ عرصہ سے اس کی آنکھوں میں ایک سرمئی چادر اتر رہی تھی جس کا رنگ روز بروز سیاہی مائل ہوا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں یوں لگا جیسے اس کے اردگرد سب کچھ ایک دھند لکے میں ہے۔ کبھی کبھی چیزیں اپنی جگہ سے کِھسکی ہوئی محسوس ہوتیں، پھر سرمئی پن میں سیاہی کا تناسب بڑھنے لگا تو گاڑی چلاتے ہوئے ایک لکیر دائیں طرف ساتھ ساتھ دوڑنے لگی جو رات کو سفید لکیر میں بدل جاتی اور وہ بڑی مشکلوں سے گاڑی کو سڑک کی درمیان والی دیوار سے دور رکھ پاتا، پھر یہ لکیر دونوں طرف آ گئی۔ عینک کا نمبر بڑھ گیا، بڑھنے لگا، لیکن اس کا مسئلہ نمبر بڑھنا یا کم ہونا نہیں تھا بلکہ یہ کہ سب کچھ اپنی بنیادوں سے کیوں کِھسک رہا ہے۔

یہ تبدیلی خاصی تیز تھی۔ پڑھاتے ہوئے محسوس ہوتا کہ اس کے طالب علم کہیں آگے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے لگتا وہ بہت پیچھے ہے۔ دوستوں سے ملتے جلتے، رشتہ داروں کی باتیں سنتے، گھر میں بچوں کے معمولات دیکھتے، ان کے رویّوں پر غور کرتے --- ہر جگہ محسوس ہوتا کہ وہ کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔

پیچھے رہ جانا اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ طبیعت کی شرماہٹ کی وجہ سے وہ ہمیشہ پیچھے رہا تھا۔ بچپن میں وہ جان بوجھ کر کلاس میں دیر سے جاتا کہ آخری بنچ پر جگہ ملے۔ کسی تقریب میں بھی اس کی یہی کوشش ہوتی کہ کسی کونے میں دبک جائے، اسی لیے وہ ساری عمر سٹیج سے بھاگتا رہا۔ بس کلاس روم ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ

بطور استاد پورے اطمینان کے ساتھ موجود ہوتا لیکن اب کچھ دنوں سے لگ رہا تھا کہ یہاں بھی اس کے پاؤں ڈگمگانے لگے ہیں۔ کئی بار خود سے سوال بھی کیا کہ کیا میں خود ہی پیچھے رہتا جا رہا ہوں یا زمانہ ہی بہت تیز رفتار ہے کہ مجھے پیچھے چھوڑتا چلا جا رہا ہے، لیکن جواب نہ ملا۔ معاملہ صرف آگے پیچھے کا بھی نہ تھا بلکہ کچھ ایسا تھا جسے وہ محسوس تو کرتا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اب کل ہی رات کی بات تھی کہ باتیں کرتے ہوئے بیٹے نے کہا ---''ابو آپ نہیں سمجھتے، چیزیں اب بدل گئی ہیں۔''

اس نے بیٹے کو تو کوئی جواب نہ دیا لیکن خود سے بار بار پوچھا کہ اب چیزیں کیوں بدل گئی ہیں۔ اس کے بچپن میں تو ایسا نہ تھا اور نہ ہی وہ اپنے باپ سے اس طرح کی گفتگو کر سکتا تھا۔ کلاس میں بھی جب کوئی طالب علم پوچھ بیٹھتا کہ اس نے فلاں پروگرام دیکھا ہے تو اسے اپنے طور پر احساس ہوتا کہ اس کا نفی میں ہلا سر دیکھ کر طالب علم نے دل میں ضرور کہا ہو گا کہ سر بہت پیچھے ہیں۔

عمر کے ایک حصہ تک ہر بڑھا ہوا قدم آگے لیے جاتا ہے لیکن پھر ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ ہر اٹھا قدم پیچھے کی طرف جاتا ہے۔ شاید وہ اسی موڑ سے گزر آیا تھا کہ اب واپسی تھی۔ سارا منظر دمِ واپسیں کی اداسیوں میں لپٹا ہوا تھا لیکن بظاہر سب ٹھیک تھا۔ بیوی مہربان خیال رکھنے والی، بچے احترام کرنے والے، پیشہ تو تھا احترام و تقدس والا، باقی معاملات بھی درمیان درمیان تھے، اس لیے ساری زندگی بین بین ہی گزری اور اسے یہ پسند بھی تھا کہ چھلانگ مارنے کی ہمت نہیں تھی اور پیچھے رہ جانے کی کسک بھی۔ سو درمیان بہت اچھا تھا لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ درمیان بھی ڈانواڈول ہوا جا رہا تھا۔

درمیان تو وہ کھونٹا تھا جس سے اس کی رسّی بندھی ہوئی تھی اور اختیار اتنا ہی

تھا جتنی رہتی تھی۔ درمیانہ طبقہ، درمیانی ملازمت، ساری عمر اگلی سیٹوں پر بیٹھنے کی حسرت ہی رہی۔ کبھی کوشش کی بھی تو اپنی جگہ پر بھیج دیا گیا۔ چنانچہ اسے یہیں سے چیزوں کو دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی مگر اب کچھ عرصہ سے یہ مرکزہ بھی تشکیک زدہ ہوا جا رہا تھا۔ خیال آتا شاید کوئی گڑبڑ اس کے اندر ہی ہے۔

اندر باہر کا یہ مخمصہ حل ہونے والا نہیں تھا اور اب تو آنکھوں میں بھی ایک سرمئی دھند چھا رہی تھی۔ جب ڈاکٹر نے بتایا کہ آپریشن کے بعد آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی تو اطمینان سا ہوا کہ شاید یہ ساری گڑبڑ اسی وجہ سے ہے، آنکھیں ٹھیک ہوں گی تو چیزیں اپنی جگہ پر واپس آ جائیں گی۔

صبح شیو کرتے ہوئے خیال آیا کہ کل آنکھوں کا آپریشن ہونا ہے اس لیے پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آج آخری دن ہے۔

آخری دن کے مناظر تو وہی تھے لیکن ایک خواہش سی تھی کہ ان سارے مناظر کو جلدی جلدی سمیٹ لے کیونکہ ایک خوش فہمی تھی کہ آنکھ بننے کے بعد سب کچھ بدل جائے گا۔ وہ ایک ایسی دنیا دیکھ سکے گا جس کا خواب ہمیشہ اس کے ساتھ رہا ہے۔ خواب دیکھنے کی بھی پرانی عادت تھی بلکہ چسکا تھا اور ان خوابوں ہی نے اسے مخمصوں سے دوچار کیا تھا کہ اس کی اپنی دنیا اور تھی، باہر کی دنیا اور۔ وہ درمیان میں کہیں لٹکا ہوا تھا یا ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ درمیان ہی ساری خرابی ہے۔ کبھی کبھار خیال آتا، میں ساری زندگی اس درمیان سے نہیں نکل سکوں گا مگر اب ایک موہوم سی خوش فہمی تھی کہ شاید ان سارے مسائل کی وجہ یہ ہو کہ وہ جس آنکھ سے سب کچھ دیکھتا ہے، اس میں کوئی خرابی ہے۔ شاید نئی آنکھ سے منظر بدل جائیں۔

آپریشن تو لمبا چوڑا نہیں تھا۔ ایک دن بعد اسے سیاہ شیشوں کی عینک لگا کر

گھر بھیج دیا گیا۔ دو تین دن نیم تاریک کمرے میں گزرے۔ اس کے اندر بے چینی بڑھنے لگی کہ عینک اترے تو منظر دیکھے۔ ڈاکٹر نے چار دن آرام کرنے کو کہا تھا لیکن وہ تیسرے دن گھر سے نکل آیا۔ عینک اتار پھینکی۔

چمکتی دھوپ میں ہر شے کھلکھلا رہی تھی۔ اسے عجب طرح کی طمانیت ہوئی۔ وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ بہت ہی دھیمے سے جیسے چپکے چپکے ایک مایوسی اس کے اندر پھیلنے لگی --- وہی دوڑ، ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی جلدی، بے ہنگم، بے قابو ٹریفک کی لائنیں، قانون شکنی، سفاکانہ قہقہے، ایک دوسرے کو دھتکارتے رویے --- ہر شے سلگ رہی تھی لیکن کسی کو نہ دکھائی دیتی نہ آگ کی تپش محسوس ہوتی --- وہ فٹ پاتھ کے ساتھ لگے جنگلے پر جھک گیا، ٹھنڈی سانس لی اور اپنے آپ سے کہنے لگا --- ''منظر جب تک واقعی نہ بدلے، آنکھ بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ---!''

~~~~~~~
~~~~~~~

پونے آدمی کی دوسری کہانی

بچپن ہی سے اُسے کُرودنے اور جس چیز سے منع کیا جائے اسے ضرور کرنے کی عادت تھی۔ پہلے پہل وہ ماں کی ڈانٹ اور روک پر بلند آواز میں احتجاج کرتا، جب دو چار بار اس پر اچھی پٹائی ہوئی تو اس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ایک دن باپ کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے بھی لمبے ہاتھوں لیا، سو اس دن سے اس کی بڑبڑاہٹ اندر اتر گئی۔ اب وہ اپنے رویے سے تو کسی ردِعمل کا اظہار نہ کرتا لیکن اندر ہی اندر اس کے خلاف اتنا ایکشن لیتا کہ اپنے مخالف کو مارتا، پیٹتا، گالیاں نکالتا اور اپنے تئیں بدلہ لے کر مطمئن ہو جاتا۔ اس کے اندر پوری دنیا آباد تھی۔ جہاں اس کی حاکمیت مستحکم تھی، ہر شے درست انداز میں چلتی تھی، کبھی کبھی وہ اپنے اندر کی دنیا کو وسعت دے کر پوری مملکت کا کنٹرول سنبھال لیتا، ٹریفک کا نظام لمحہ بھر میں درست ہو جاتا، دفتروں کی حالت ٹھیک ہو جاتی اور --- اور، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر باہر آن گرتا، پھر وہی کرُودنا --- کرُودنا اور کرُودنا۔

اس دُوئی نے اسے ہر شے کے بارے میں مشکوک کر دیا۔ منہ پر جواب نہ دینا اور لمحہ بھر اندر جا کر پورا مقابلہ کرنا۔ لوگ کہتے، وہ روز بروز شرمیلا ہوتا جا رہا ہے۔ سکول میں، پھر کالج اور یونیورسٹی میں اس کی ہم جماعت لڑکیاں اس سے مذاق کرتیں تو اس کے کان تک سرخ ہو جاتے، وہ ایک لفظ نہ بولتا، لیکن اندر کی دنیا میں جا کر ان کے جسموں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔ ایک عجب طرح کا تشدد، جس میں ایک لذت تھی۔ پھر ایک اور بات ہوئی۔ وہ بڑی عمر کی خواتین جن کے تقدس کے بارے

میں سوچنا بھی گناہ تھا، راتوں کو اس کے خوابوں میں شریکِ بستر ہونے لگیں۔ رات بھر لذتوں سے ہمکنار ہو کر صبح جب وہ خاتون سامنے آتی تو اسے عجب طرح کی شرمندگی ہوتی۔ وہ نظریں چار کرنے سے گھبراتا اور اکثر بات کا جواب دیے بغیر اِدھر اُدھر ہو جاتا۔

اختیاری اور بے اختیاری کی یہ کیفیت لذت بھری بھی تھی اور دکھ اور شرمندگی سے لبریز بھی۔

میں کیا ہوں اور یہ سب کچھ کیا ہے؟

اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ دن مذہب کی طرف بھی جھکاؤ ہوا، لیکن طبیعت نہ لگی اور کچھ روز باقاعدہ نماز پڑھ کر دوبارہ پرانی ڈگر پر آ نکلا۔

شادی کے بعد بھی بہت عرصہ تک یہی صورت رہی، بیوی ذرا دبنگ قسم کی تھی، اس نے اسے اپنے ساتھ تیز دوڑانے کی خاصی کوشش کی اور کچھ ہو بھی گیا لیکن اندر اور باہر کا تضاد، ایک ایسی خلیج جسے پاٹنا اب اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ بچوں کی کلکاریوں نے سرمئی اداسی میں رنگ بھرے، ملازمت کی بہتر صورتِ حال اور مالی حالت کے بہتر ہونے نے بھی اسے خاصا تبدیل کیا لیکن جگمگاتی، مسکراتی دنیا کے پیچھے ذرا ہی سا چلنے کے بعد ایک سنسناتا خلا، جس کی گہری کھوہ سے گزر کر ایک اداس، ویران منظر تھا۔ تہ در تہ، تاحدِ نظر --- تاحدِ نظر۔

پھر اس نے کتابوں میں پناہ لی۔ کتابوں کی دنیا پراسرار بھی تھی اور لذت بھری۔ جانے کتنی ہی کتابوں کے آنگن آنگن ہوتا وہ ایک رات دُھنیا کے پاس پہنچا جو دنیا سے بے خبر منہ پر کپڑا لپیٹے رُوئی دُھن رہا تھا، تن تن کی لے کے ساتھ روئی کے گالے ہوا میں اُڑ رہے تھے اور اس کے سامنے رکھا ڈھیر لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا، اُڑ

کر دوسری طرف ،گر رہا تھا۔ لگا برف پڑ رہی ہے۔سردی کے خنک احساس نے اس کے وجود پر چٹکی لی۔ اتنے میں ڈھیر ختم ہو گیا۔ دُھنیا نے نیا ڈھیر لگانے سے پہلے لمحہ بھر کے لیے منہ سے کپڑا ہٹایا تو وہ بولا ---

''اے حلاج! مجھے بتا میں کیا کروں؟''

دُھنیا نے سر گھما کر اسے دیکھا، ہنسا، ہنسا، خوب ہنسا، پھر بولا ''میں کیا بتاؤں؟ میں تو تمہیں دُھننے کا طریقہ ہی بتا سکتا ہوں''

اس نے کہا --- ''تو وہی بتا دو''

دُھنیا نے جواب دیا --- ''دُھنو، خوب دُھنو، اپنے آپ کو دُھنو، اتنا کہ رُوئی کے اُڑتے گالے بن جاؤ، پھر اِن اُڑتے لپکتے گالوں کے ساتھ اوپر اُٹھو اور اپنا تماشہ کرو۔''

یہ کہہ کر اس نے ڈھیر آگے کر لیا، تن تن --- برف پڑنے لگی۔

اُس نے اپنے آپ کو دُھنا، اتنا دُھنا کہ پرزے پرزے ہو گیا۔ اوپر اٹھا، نیچے دیکھا، لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ اوپر نیچے ایک ہی کیفیت تھی، سرمئی دھند اور اس میں تیرتا ہوا وہ ایک نقطہ جسے کہیں ٹھہراؤ نہ تھا۔

اس نے چیخ کر کہا --- ''اے حلاج! مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

دُھنیا نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے کہا --- ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ پتھر مارنے والوں کے پتھروں نے تو تکلیف نہ دی اور پھول زخم بنا گیا۔''

دُھنیا نے ہاتھ روک لیا، منہ سے کپڑا ہٹایا اور بولا --- ''پتھر مارنے والے تو عتابِ شاہی کے ڈر سے مار رہے تھے، ان کا مَن ساتھ نہیں تھا، مگر پھول

مارنے والا عتاب سے نہ ڈر کر بھی ڈر رہا تھا۔''

وہ ایک لمحہ چپ رہا پھر کہنے لگا --- ''تو اپنے اندر کے عتاب کے شکار ہے، اس سے نکل۔''

''کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''کسی فرزانے کے پاس جا، نہ ملے تو کوئی دیوانہ تلاش کر۔''

محلّہ میں حاجی صاحب بڑے سیانے آدمی گنے جاتے تھے۔ سبزی کی معمولی سی دکان سے وہ آڑھتی ہو گئے تھے اور آدھا محلّہ ان کی ملکیت تھا۔ حاجی صاحب اس کی بات سن کر ہنسے، خوب ہنسے، پھر بولے ----

''بھائی ہم تو پہلے ہی تمہیں سمجھاتے رہے ہیں کہ دنیا کے ساتھ چلو، اس کے مزاج کو سمجھو۔''

اس نے خلوصِ دل سے عہد کیا کہ اب وہ دنیا کے مزاج کو سمجھے گا۔ سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ کئی فائلوں پر جلدی دستخط کرنے کے صلہ میں دنیا بڑی رنگین لگی لیکن ایک بار غلطی سے ایک ایسی فائل پر دستخط ہو گئے جس سے دنیا تو رنگین سے رنگین تر ہو گئی لیکن ایک بیوہ کا گھر چھن گیا۔ وہ روتے ہوئے اس کے کمرے میں آئی اور بولی ---

''بیٹا! میں تو تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، تو نے مجھے بے آسرا کر دیا ہے لیکن میں تمہیں بددعا نہیں دوں گی۔''

فضا میں بنائی ہوئی ساری چتری متری رنگین چھت لمحہ بھر میں زمین بوس ہو گئی۔ اس نے چھلانگ لگائی اور اپنے اندر اتر گیا۔ وہی گھپ اندھیرا، ٹامک ٹوئیاں۔ بچوں کو کچھ اچھی عادتیں پڑ گئی تھیں، روز چخ چخ ہونے لگی، بیوی کا موڈ بھی خراب رہنے لگا۔

اسے دُھنیے کی بات یاد آئی۔ اب کسی دیوانے کو تلاش کرنا چاہیے۔ دیوانہ فٹ پاتھ پر مل گیا، اس کی بات سن کر بولا --- ''میرے پاس جواب ہوتا تو پہلے خود کو ٹھیک نہ کرتا، بہرحال جا خدا کے ناموں کا ورد کیا کر، تجھے کچھ سکون تو ملے۔''

شدت پسندی تو مزاج کا حصہ تھی ہی، شدومد سے ناموں کا ورد ہونے لگا، واقعی ایک سکون ملا۔ سوچا ''شاید اب اپنی راہ پر لگ گیا ہوں۔''

لیکن ایک دن عجیب بات ہوئی۔ فٹ پاتھ پر ایک لمبا تڑنگا شخص دفعتہً سامنے آ گیا اور بولا ---

''اُلو کے پٹھے، سمجھتے ہو اس طرح بچ جاؤ گے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور یہ جا وہ جا۔ دیر تک اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ گم صم فٹ پاتھ پر، نہ اندر، نہ باہر۔

گھر آیا تو سُوجا منہ دیکھ کر بیوی گھبرا گئی ---

''کیا ہوا، کسی سے لڑائی ہو گئی، ہوا کیا، کچھ بولو تو سہی۔''

وہ کچھ نہ بولا --- بس روتا گیا، روتا گیا۔ بیوی کے ہاتھ پیر پھول گئے، کچھ سمجھ نہ آیا تو کہنے لگی ---

''لیٹ جاؤ، کچھ دیر لیٹ جاؤ۔''

وہ چپکے سے لیٹ گیا۔ گھنٹہ بھر بعد بیوی چائے لے آئی اور بولی ---

''تم بہت بے سکون رہنے لگے ہو، نماز ہی پڑھ لیا کرو۔''

کچھ دیر بعد وہ پیالی لینے آئی تو حیرت سے دروازے ہی میں کھڑی رہ گئی۔ وہ بڑے خشوع سے نماز پڑھ رہا تھا۔ بیوی نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور ہاتھ اٹھا کر کہا ---

''یا اللہ شکر ہے۔''

اب معمول بن گیا، پہلے بیوی صبح خود اٹھتی تھی، اب وہ الارم لگاتا، اسے جگاتا اور دونوں نماز پڑھتے۔ چند دنوں میں عادت سی بن گئی، اندر باہر ایک ہو گئے۔ تھوڑی سی دنیا کی رنگینی بھی۔ تھوڑا سا اطمینان بھی۔ سلسلہ ٹھیک چل رہا تھا کہ پھر ایک غلطی ہو گئی۔ اس بار اس کے ماتحت نے دھوکا دیا، ایک یتیم بچے کا حق مارا گیا۔

بچے کا تصور کر کے ہی اسے اپنے آپ سے گھِن آنے لگی۔ اس صبح اس نے الارم نہیں لگایا۔ اٹھے تو بیوی کہنے لگی۔

''آج آپ نے الارم نہیں لگایا۔ دونوں کی نماز گئی۔''

وہ بولا --- ''میں نے جان بوجھ کر نہیں لگایا۔ اس اٹھک بیٹھک کا آخر کیا فائدہ؟''

''خدا کا خوف کرو'' بیوی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے --- ''تم نے تو سیدھا جہنم میں جانا ہے۔''

''تو تم جنت میں چلی جانا'' وہ چڑ کر بولا --- ''اتنے عرصہ سے تو ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں، آگے اکٹھے نہ بھی ہوئے تو کیا!''

بیوی نے غصہ سے دروازہ بند کیا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

پھر وہی گھپ اندھیرا، ٹامک ٹوئیاں، اختیار اور بے اختیاری کے درمیاں ڈالنا اور کرُودتے جانا۔

ایک شام بچوں نے بڑے پارک جانے کا اصرار کیا تو وہ بے دِلی سے ساتھ چل پڑا۔ پارک میں پہنچتے ہی بچے جھولوں اور گھسیٹ پر جھپٹ پڑے۔ بیوی کو ایک پرانی سہیلی مل گئی۔ وہ اس سے باتیں کرتی لان میں اتر گئی۔ وہ اکیلا بنچ پر بیٹھا

رہ گیا۔ کافی دیر بیٹھا رہا، پھر کنول کے تالاب کی طرف چل پڑا۔ بھلے دنوں میں وہ کبھی یہاں آیا کرتا تھا۔ تالاب اسی طرح چپ اور خاموش تھا۔ گردن گردن پانی میں ڈوبے کنول ایک دوسرے کے منہ چوم رہے تھے۔ دفعتہً اسے خیال آیا اس سڑاند زدہ تالاب میں یہ سفید پھول کتنے اجنبی ہیں۔

اندر باہر ایک ہو گیا۔

اس رات وہ بڑے مزے کی نیند سویا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

بے زمیں

پرانی البم دیکھتے دیکھتے دفعتہً احساس ہوا کہ اس میں ماں کی کوئی تصویر نہیں۔ البم دیکھنے کا خیال بھی ایسے ہی آ گیا، کوئی کام نہیں تھا۔ خیال آیا پرانی یادوں کو ہی تازہ کر لیا جائے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ پوری البم میں ماں کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس وقت تو البم بند کر دی، سوچا کہیں اور سے مل جائے گی لیکن کوئی بات ذہن میں چبھتی رہی۔ دن میں تو مصروفیت نے ادھر زیادہ توجہ نہ ہونے دی لیکن رات کو سونے سے پہلے اس نے غیر شعوری طور پر پھر البم نکال لی اور زیادہ غور سے ایک ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ جن تصویروں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ ان میں ماں کو موجود ہونا چاہیے، ان میں بھی وہ موجود نہ تھی۔ ساری کی ساری البم اس کے وجود سے خالی تھی۔ اب ذرا تشویش ہوئی، ادھر ادھر کی درازوں کو دیکھا، ایک آدھ پرانی فائل کریدی لیکن ماں کی تصویر کہیں نہیں تھی۔ رات زیادہ ہوئی جا رہی تھی، بیوی نے قدرے ڈانٹ کر کہا ''سوتے کیوں نہیں، صبح کہو گے نیند پوری نہیں ہوئی۔'' وہ لیٹ تو گیا لیکن کوئی چیز ذہن میں مسلسل چٹکیاں بھرتی رہی، آخر ماں کی تصویر کیوں نہیں، پریشانی بڑھی تو اس نے اپنے آپ کو تسلّی دی۔ شاید کسی ایسی جگہ پڑی ہو جو اس وقت ذہن میں نہیں آ رہی، کل پھر دیکھوں گا۔

دن گرد و غبار میں لپٹے شور شرابے میں گزر گیا۔ دفتر میں بھی مصروفیت روز سے کچھ زیادہ ہی رہی۔ گھر آیا تو کچھ رات کی نیند کی کمی، کچھ معمول سے زیادہ کی تھکاوٹ، کھانا کھاتے ہی سو گیا لیکن شام کو چائے پیتے پیتے پھر کوئی شے اس کے

ذہن میں رینگنے لگی۔ جلدی جلدی چائے ختم کر کے اس نے ایک ایک الماری، ایک ایک فائل دیکھ ڈالی۔ اس کی بوکھلاہٹ اور تیزی دیکھ کر بیوی بولی --- ''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

وہ کچھ نہ بولا، اسے بتاتا بھی کیا؟

اب پریشانی بڑھ گئی تھی۔

''کمال ہے میرے پاس ماں کی کوئی تصویر ہی نہیں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ آنکھیں بند کر کے ماں کا تصور کیا لیکن ایک ہیولے کے سوا کچھ نہ ملا۔ ایک ایسا ہیولیٰ جس کے کوئی خدوخال نہیں تھے۔ اب وہ گھبرا گیا --- ''میری ماں کیسی تھی؟''

کس سے پوچھے، باپ تو مدت ہوئی مر چکا تھا۔ تو میری ماں تھی؟ اسے خود ہی اس احمقانہ سوچ پر ہنسی آ گئی۔ ماں نہیں تھی تو میں کہاں سے آیا۔ لیکن اس کے پاس ماں کی تصویر کیوں نہیں، البم میں ہر شخص کی تصویر موجود ہے لیکن ماں؟

اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ ایک عجیب طرح کی بے سکونی رہی۔ ذرا آنکھ لگتی تو ایک ہیولیٰ سا رقص کرنے لگتا، کوئی شباہت محسوس نہ ہوتی۔ ماں تھی تو اس کی صورت کیسی تھی؟ بڑی کوشش سے اس کا چہرہ بنانے کی کوشش کرتا لیکن چہرے کی لکیریں گڈمڈ ہو جاتیں، پہچان نہ ہو پاتی۔ صبح اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر بیوی نے پوچھا --- ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا''

اس نے سر ہلایا --- ''نیند نہیں آئی۔''

''کیا بات ہے، دو تین دن سے تم کچھ پریشان سے ہو؟''

''کچھ نہیں''

''کوئی دفتری پریشانی ہے؟''

''کچھ نہیں'' وہ قدرے کرخت آواز میں بولا --- ''کچھ بھی نہیں۔''

بیوی چپ ہو گئی۔ اس کے لیے یہ لہجہ خاصا غیر مانوس تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی میں بھی وہ اس لہجے میں بات نہیں کرتا تھا۔ دن بھر وہ اسی کے بارے میں فکرمند رہی۔ شام کو چائے پیتے ہوئے اس نے بڑی ملائمت سے کہا --- ''مجھ سے کچھ ہو گیا ہے''

''نہیں نہیں'' اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی واقعی اس کے بارے میں بہت فکر مند ہے۔

''تو پھر کیا بات ہے، دفتر میں کچھ......''

''نہیں بھئی'' اس نے بات کاٹی --- ''بات یہ ہے کہ......'' وہ چپ ہو گیا۔ اسے کیا بتائے۔

''کیا بات ہے؟'' بیوی کی پریشانی اور بڑھ گئی --- ''جان بتاؤ نا کیا بات ہے۔''

''وہ یہ......'' وہ پھر چپ ہو گیا، کیا بتائے۔

''جان بتاؤ نا کیا بات ہے؟''

''وہ --- دراصل --- البم میں ماں کی کوئی تصویر نہیں۔''

بیوی کو کچھ دیر اس کی بات سمجھ نہ آئی۔ وہ خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی --- ''میں سمجھی نہیں۔''

''میں یونہی پرانی البم دیکھ رہا تھا، عجیب انکشاف ہوا کہ اس میں ماں کی کوئی تصویر ہی نہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟''

''ہے تو سہی، آخر میری ماں کی کیا شباہت ہے۔''

''تصویر نہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمہاری ماں تھی ہی نہیں'' وہ بولی،
پھر خود ہی ہنس پڑی ''بغیر ماں کے تو کوئی نہیں آتا''۔

''یہی تو پریشانی ہے'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور بیوی کے جواب کا انتظار کیے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ماں کی تصویر نہ ہونا اور بات ہے لیکن میرے ذہن میں تو اس کی کوئی شباہت بھی نہیں، بس ایک ہیولیٰ سا ہے اور ہیولے کا تو کوئی وجود نہیں ہوتا، کوئی پہچان نہیں بنتی۔ لیکن میں تو ہوں اس لیے میری ماں تو کوئی ہو گی ہی، پر اس کی صورت کیا ہے، اس کا وجود؟

پھر خیال آیا کہ ماں کا کوئی وجود نہیں تو میں کیا ہوں، ہوں بھی کہ نہیں، نہیں تو پھر یہ کون ہے جو سوچ رہا ہے کہ میری کوئی ماں نہیں، اس کا مطلب ہے کہ میں تو ہوں لیکن ماں کا وجود مشکوک ہے۔

ماں کا وجود مشکوک ہو گیا ہے۔ شاید میں نے خود ہی اسے مشکوک کر دیا ہے۔ اس رات وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سویا۔ آنکھ بند کر کے ماں کے ہیولے کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا لیکن اب تو ہیولیٰ بھی تھرتھرانے لگا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ کو چھوتا، اپنے جسم پر چٹکی کاٹتا، میں ہوں --- میں بالکل ہوں، لیکن میری ماں --- میرے آس پاس سب کچھ موجود ہے، اپنا وجود رکھتا ہے لیکن مجھے اس کا احساس نہیں، میں صرف اپنے آپ میں گم ہوں، اپنے تسلسل کے نشے میں سرشار ہوں اور ماں کے وجود کو، جو میری بنیاد ہے، گم کر بیٹھا ہوں، اس لیے میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

صبح نیند سے بوجھل اور بے آرام آنکھوں کو دیکھ کر، اس سے پہلے کہ بیوی کچھ پوچھتی، اس نے کہا ---"مجھے معلوم ہو گیا ہے"۔

"کیا؟" بیوی نے بے چینی سے پوچھا۔

"کہ میں ساری عمر اپنی تاریخ کے پیچھے دوڑتا رہا ہوں اور اپنے جغرافیے کو بھول بیٹھا ہوں۔"

آنکھیں آپ ہی آپ بھر آئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

بلیک ہول

کام چند ہی گھنٹوں کا تھا، اس لیے یہی سوچا کہ رات کو سفر کر لیا جائے۔ خیال تھا کہ صبح نو دس بجے پہنچ جائے گا اور کام ختم کر کے کہیں بیٹھ کر دو لقمے کھائے گا اور واپس چل پڑے گا۔ بیوی بچوں کو یہی کہا تھا کہ سہ پہر کو چلنے سے پہلے فون کر دے گا کہ وہ اسے لینے آ جائیں۔ بڑا بیٹا گیارہ کے قریب اسے بس اڈے پر اتار آیا۔ سیٹ بک تھی اس لیے کوئی دقت نہ ہوئی۔ بریف کیس اوپر والی گرِل پر رکھ کر وہ اپنے نمبر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ ساتھ والی سیٹ سارے سفر میں خالی رہی اس لیے وہ پاؤں پسارے ٹیڑھا میڑھا ہو کر لمبا ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ سٹاپ پڑتا تھا۔ بس رکی تو آنکھ کھل گئی۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ بھی اترا، چائے پی اور واش روم سے فارغ ہو کر دوبارہ اپنی سیٹ پر جم گیا۔ چند ہی لمحوں میں نیند نے آہستگی سے اس کی پلکوں پر دستک دی اور دھیرے دھیرے اس کے سارے وجود میں اتر گئی۔ سفر میں سونا اس کی پرانی عادت تھی۔ آنکھ کھلی تو بس شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر ہما ہمی تھی، سکول جانے والی ویگنیں بچوں سے بھری ہوئی تھیں، دفتر جانے والے پیدل، سائیکلوں، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں میں رواں دواں تھے۔ دن کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے اور خوشگوار دھوپ کے ساتھ ساتھ زندگی کا رقص رفتہ رفتہ تیز ہوا جا رہا تھا۔

اڈے سے نکل کر اپنے پسندیدہ ریستوران کی طرف چل پڑا جو تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ بیرے اسے پہچانتے تھے۔ ایک بیرا لپک کر اس کی طرف آیا، مسکرا کر

بریف کیس اس کے ہاتھ سے لیا اور بولا ---

''سر اس بار تو آپ خاصی دیر سے آئے ہیں۔''

''ہاں'' اس نے سر ہلایا اور واش روم کی طرف چل پڑا۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو گیا۔ اتنی دیر میں بیرا ایک میز پر اس کا بریف کیس رکھ چکا تھا۔ اپنی پسند کا آرڈر دے کر اس نے اخبار اٹھا لیا۔ وہی روز کی پٹی پٹائی خبریں، چبائے، بار بار چبائے الفاظ جن میں اب سڑاند آنے لگی تھی۔

ناشتہ کر کے اس نے بل دیا، ٹپ کی رقم دیکھ کر بیرے کی آنکھوں میں چمک آئی ---

''سر دوپہر کو آئیں گے نا''۔

''شاید'' اس نے بریف کیس اٹھایا لیکن بیرے نے آگے بڑھ کر بریف کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے بٹوے کو پینٹ کی پچھلی جیب میں جما کر رکھا۔ بٹن بند کیا۔ بیرا آگے آگے، وہ پیچھے پیچھے ریستوران کے دروازے پر پہنچے۔ بیرے نے ادب سے دروازہ کھولا، اس نے بریف کیس لیا، بیرے کے سلام کا جواب دے کر ہجوم کے سیلِ رواں میں اتر گیا۔ باری باری دو تین ٹیکسیاں اس کے قریب رکیں لیکن اس نے سر ہلا کر نفی کا اشارہ کیا، سوچا دفتروں میں سلام دعا کرتے، میزیں صاف کرتے، فائلوں کی گرد جھاڑ کر کام شروع ہوتے ہوتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ ہی جاتا ہے اس لیے کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے، ہاتھ پیر کھل جائیں گے اور وقت بھی گزر جائے گا۔ دائیں طرف نسبتاً چھوٹی سڑک تھی جس پر رش کم ہوتا تھا اور شارٹ کٹ بھی تھا۔ وہ ادھر مڑ لیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ دائیں طرف والی گلی سے وِرد کی آوازیں سنائی دیں، جنازہ آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی سڑک سے متعلقہ دفتر جاتا تھا

اور سڑک کے آس پاس سے اچھی طرح شناسا تھا۔ جنازہ سڑک پر آ گیا۔ سوچا قبرستان زیادہ دور نہیں کیوں نہ مرنے والے کو دو قدم چل کر رخصت کیا جائے۔ آج صبح کی نماز سفر کی وجہ سے رہ گئی تھی، چلو جنازے کی نماز ہی پڑھ لی جائے۔ وہ جنازے کے جلوس کے ساتھ چل پڑا۔ لوگ مرنے والے کی خوبیوں اور جواں مرگی کا ذکر بڑی رقت سے کر رہے تھے۔

بریف کیس میں کاغذوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس نے اطمینان سے اسے جنازہ گاہ کی چھوٹی سی دیوار کے ساتھ ٹکا دیا اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔ نماز سے پہلے مولوی صاحب نے موت و حیات کے موضوع پر مختصر سی تقریر کی۔ سلام پھیر کر جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ بھی مرنے والے کا منہ دیکھنے والوں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

جواں مرگ کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی اٹھے گا اور پوچھے گا ''بھائی صاحب آپ کہاں سے آئے ہیں۔''

چہرہ بہت ہی اپنا اپنا لگا۔ اس پر اطمینان کی کرنیں، سوچا اب آ ہی گیا ہوں تو قبر پر مٹی کے دو ٹک بھی ڈالتا جاؤں۔ بڑے بزرگوں سے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ قبر پر دو ٹک مٹی ڈالنے سے بڑا ثواب ملتا ہے اور مرنے والے کو بھی شانتی ہوتی ہے۔

مٹی ڈالنے کے بعد دعا ہوئی اور قُل کے اعلان کے ساتھ ہی لوگ واپس مڑے۔ وہ جنازہ گاہ کی طرف آیا۔ ہاتھ دھوئے اور بریف کیس اٹھا کر سڑک کی طرف چل پڑا۔ قبرستان سے نکلتے نکلتے غیر ارادی طور پر ہاتھ سے پچھلی جیب کو ٹٹولا۔ ایک جھٹکا لگا، بٹوا موجود نہیں تھا۔

''اس پردیس میں ---'' اسے پسینہ آ گیا۔ ''کسی نے نکال لیا ہے یا مٹی

ڈالتے، جھکتے ہوئے ---'' وہ تیزی سے مڑا۔ تازہ قبر پر پڑے پھول ہوا سے پتی پتی ہو رہے تھے۔ جلدی جلدی نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھا، تازہ نیم گیلی مٹی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا جھانک رہا تھا، اس نے جھک کر اسے نکالا۔ کاغذ کے ٹکڑے پر لکھے نمبر اسی کے ہاتھ کے تھے۔ چلتے چلتے اس نے ضروری ٹیلی فون نمبر لکھ کر بٹوے میں رکھے تھے۔ اطمینان نے پنکھ پھیلائے لیکن --- اب چارہ بھی کیا تھا۔ آہستہ سے اسی طرف سے جہاں سے کاغذ کے ٹکڑے نے جھانکا تھا، مٹی ہٹائی، ایک خوف بھی آہستگی سے اس کے وجود پر رینگ رہا تھا۔ کسی نے دیکھ لیا تو --- مگر، ادھر ادھر دیکھا، ہُو کا عالم تھا۔ ہاتھوں میں تیزی آ گئی۔ دو تین وزٹنگ کارڈ ملے۔ یہ بھی اسی کے تھے۔ ہاتھوں میں تیزی آ گئی۔ دو تین چیزیں اور ملیں اور وہ مٹی ہٹاتے ہٹاتے سلوں تک جا پہنچا۔ بٹوا دو سِلوں کی درمیانی درز میں پھنسا ہوا تھا۔ لپک کر بٹوا اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ درز میں پوری طرح پھنسا ہوا تھا۔ ایک ہی صورت تھی کہ سِل ہٹائی جائے، چارہ بھی کیا تھا۔ جھک کر زور لگا کر سِل کر ہٹایا، بٹوا اندر جا گرا۔ جھکا، اور جھکا اور چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر بٹوا اٹھا لے کہ مٹی کا پھاکھا اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ وہ سر کے بل اندر جا گرا۔ چیخ نکل گئی۔ گھپ اندھیرا، نیچے لجلجا سا جسم، کافور کی تیز بُو۔

ایک لمحہ --- دو، تین یا ---؟

بٹوے کو مضبوطی سے پکڑ کر وہ پوری قوت سے اچھلا، بھربھری مٹی میں سے ہوتا باہر آ گرا۔ خوف سارے وجود پر دستکیں دے رہا تھا۔ بریف کیس اٹھانا بھی یاد نہ رہا۔ تقریباً دوڑتا، ہانپتا باہر کی طرف بھاگا۔ شاید کسی اور طرف نکل آیا۔ یہ وہ سڑک نہ تھی۔ علاقہ با رونق تھا لیکن اجنبی اجنبی سا محسوس ہو رہا تھا۔ سوچا قبرستان کی دوسری طرف نکل آیا ہوں۔ کپڑے جھاڑے، سر کے بالوں سے مٹی اتاری۔

''اب تو ٹیکسی پکڑنا ہو گی'' اپنے آپ سے کہا۔ بٹوا دیکھا، سب بڑے نوٹ تھے --- '' ٹیکسی والے سے خواہ مخواہ تکرار ہو گی۔'' بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی '' بسکٹ لے لوں، چینج بھی مل جائے گا۔''

سڑک خاصی چوڑی تھی، عجب طرح کی نئی نئی چیزیں تھیں۔ کراس کرتے ہوئے، اپنے خیالوں اور خوف میں ایسا گم تھا کہ یہ احساس بھی نہ ہوا کہ لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے ہیں۔ فٹ پاتھ پر پہنچا تو ایک بچہ جو ماں کی انگلی پکڑے گزر رہا تھا اسے دیکھ کر بری طرح چونکا اور ماں سے کچھ کہنے لگا، لیکن وہ ابھی تک خوف کے لبادے میں گم تھا، گھپ اندھیرا، کافور کی تیز بُو اور لجلجا سا جسم --- تھرتھری لے کر وہ سامنے --- کے سٹور میں داخل ہوا۔

''بسکٹوں کا ڈبّا دیجیے۔''

دکاندار اور دوسرے لوگوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

'' بسکٹ'' اس نے زور دیا۔

دکان دار نے سر ہلایا اور شیلف سے ایک ڈبّا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ نئی سی پیکنگ تھی مگر اس لمحے سوائے گھپ اندھیرے اور کافور کی بُو کے کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ اس نے بٹوے سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دکان دار کے ہاتھ میں دے دیا۔

دکان دار نے الٹ پلٹ کر نوٹ کو دیکھا، پھر اپنے ساتھی کو دکھایا ---

''یہ کہاں کا نوٹ ہے؟''

اسے کچھ سمجھ نہ آیا --- ''میں سمجھا نہیں۔''

اس کی پریشانی دیکھ کر دکان دار کا ساتھی بولا ---

''گھبرایئے نہیں، ساتھ ہی منی چینجر ہے۔ ان سے تبدیل کرا لیتے ہیں۔ آیئے۔''

روبوٹ کی طرح، خالی ذہن، کافور کی بُو اور گھپ اندھیرے کی بانہوں میں لپٹا، وہ پیچھے پیچھے اور دکان دار کا ساتھی آگے آگے، ساتھ والی دکان میں داخل ہوئے۔

منی چینجر نے نوٹ کو کئی بار الٹ پلٹ کے دیکھا، پھر کونے میں بیٹھے ایک بوڑھے کو ، جس نے موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی، نوٹ دکھایا۔ بوڑھے نے نوٹ کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور سال خوردگی سے لڑکھڑاتی آواز میں اس سے پوچھا۔

''یہ نوٹ آپ کو کہاں سے ملا۔ یہ تو ایک ہزار سال پرانا ہے۔''

اسے کچھ سمجھ نہ آیا، بس بٹر بٹر اسے دیکھا کیا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

گملے میں اُگا ہوا شہر۔ ۲

جنازہ ایک بار پھر گم ہو گیا تھا۔

برسوں پہلے بھی یوں ہی ہوا تھا کہ جب اسے سُولی سے اتار کر چارپائی پر ڈالا گیا اور ہجوم قبرستان کی طرف روانہ ہوا تو درمیان میں کہیں جنازہ گم ہو گیا، لوگ اس کی تلاش میں سڑکوں اور گلیوں میں پھیل گئے اور جب جنازہ نہ ملا تو ایک دوسرے سے الجھ پڑے، جنازہ اب پھر گم ہو گیا تھا لیکن اس بار صورت حال کچھ مختلف تھی۔ دیکھنے میں وہ اگرچہ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اندر ہی اندر کوئی شے اسے کھوکھلا کیے جا رہی تھی، لوگ اس کی صحت کی باتیں بھی کرتے تھے اور اس کی موت کے منتظر بھی تھے چنانچہ جب اس کی موت کا اعلان ہوا تو لوگوں کو کچھ زیادہ تعجب نہ ہوا۔

جنازہ اٹھنے کے وقت کے آگے پیچھے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ٹولیوں اور گروہوں کی شکل میں گلیوں اور سڑکوں میں پھیلے لوگ اسی کی باتیں کر رہے تھے، اسی کی اچھائیاں اور برائیاں۔ ''دفعتاً'' کسی کو احساس ہوا کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور جنازہ ابھی نہیں اٹھا، ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے پوچھا۔ کسی نے کہا جنازہ تو اٹھ چکا اور اب قریبی مسجد میں نماز کی ادائیگی ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے۔ لوگ مسجد کی طرف چل پڑے، مسجدیں تو کئی تھیں، کسی نے پوچھا ...... اس کا عقیدہ کیا تھا؟ جنازہ کس مسجد میں گیا ہے؟ اس کا عقیدہ کیا تھا، یہ سوال ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور چوتھے تک پہنچا، معلوم نہیں، ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے کیا کہا۔ اب انہوں نے ایک ایک مسجد دیکھنا شروع کی، ہر مسجد کے دروازے پر کسی نہ کسی مسلک کی تختی لگی ہوئی تھی اور جنازہ وہاں موجود نہیں تھا۔

ایک بے یقینی کی فضا پر پھیلائے چاروں طرف منڈلا رہی تھی، ایک نے دوسرے سے پوچھا --- ''کچھ معلوم ہے؟''

---

* اس سلسلے کی پہلی کہانی ۱۹۸۰ء میں لکھی گئی تھی۔ (ر۔ا)

دوسرے نے نفی میں سر ہلایا --- "کچھ نہیں۔"
کسی نے کسی سے سوال کیا --- "کچھ پتہ ہے؟"
"نہیں" اس نے تیسرے کی طرف دیکھا، تیسرے نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ تلاش اور لاتعلقی ساتھ ساتھ چل رہے تھے، قدم سے قدم ملائے۔
"ہوا کیا؟"
"کچھ معلوم نہیں۔"
"تو پھر ......" ---- چپ پتھرائے چہرے، خاموش سوال کرتی آنکھیں!
"حیرت......"
"نہیں، حیرت تو نہیں"
"تو پھر ......"
"کچھ معلوم نہیں"
رینگتی سرگوشیاں گھٹنوں کے بل اٹھیں اور دبے پاؤں چاروں طرف پھیل گئیں، دبی دبی رونے کی آوازیں آہستہ آہستہ بین میں اور پھر کہرام کی صورت نمایاں ہونے لگیں، کئیوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں لیکن رو سب رہے تھے اور آہیں بھی بھر رہے تھے۔
"ہوا کیا ہے؟" کسی نے کسی سے پوچھا۔
"معلوم نہیں"
"تو پھر ......" لیکن رونے کا سبب پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، بین کی آوازوں نے ایک ایسا دائرہ بنا لیا تھا جس نے پورے ماحول کو اپنی بگل میں دبا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد رونے کی شدت میں ذرا سی کمی ہوئی تو ایک نے دوسرے سے پوچھا ......
"مرنے والا کون تھا؟"
"تمہیں نہیں معلوم!" اس نے غصے سے اسے گھورا ...... اور پھر اسے خیال آیا 'واقعی مرنے والا کون تھا؟"
"مجھے تو نہیں معلوم۔" اس نے دھیمی آواز سے کہا اور آگے والے سے پوچھا....

”مرنے والا کون تھا!“

”تم نہیں جانتے۔“ اس نے بھی غصہ سے گھورا، لیکن لمحہ بعد ہی وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔

”مرنے والے کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے؟“ پہلے والے نے سوچا، اسے کچھ یاد نہ آیا، اس نے ساتھ والے سے پوچھا ”مرنے والے سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔“

”میرا......“ ساتھ والے نے جواب کے لیے منہ کھولا، لیکن خود ہی چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ مرنے والے سے اس کا کیا رشتہ ہے، سوال ایک سے دوسرے تک، دوسرے سے تیسرے چوتھے سے ہوتا ہوا سڑکوں اور گلیوں میں پھیل گیا، روتے، بین کرتے لوگوں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا، جواب نہ ملا تو پل بھر کے لیے چپ ہوئے اور پھر رونا شروع کر دیا۔

”تو تم اسے جانتے تھے؟“ کسی نے کسی سے کہا۔

”جانتا تو تھا لیکن......“

”لیکن کیا؟“

”جانتا تو تھا لیکن پھر بھی ہر بار۔“

”کیا ہر بار؟“

”ہر بار وہ مجھے اپنی دلفریب باتوں میں الجھا لیتا تھا۔“

”تو وہ تمہارا ساتھی نہیں تھا۔“

”تھا یا شاید نہیں تھا۔“ جواب دینے والے نے بے یقینی سے کہا۔ بہت دیر چپ رہا پھر بولا --- ”شاید وہ میں ہی تھا۔“

”شاید میں بھی تھا۔“ دوسرے نے سوچتے ہوئے کہا۔

ہجوم گلیوں اور سڑکوں پر بکھرا ہوا تھا اور جنازے کی تلاش جاری تھی، ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

”یہاں تو نہیں۔“

"نہیں یہاں بھی نہیں۔"

گھر تو سارے ایک جیسے تھے، گلیاں اور سڑکیں بھی ایک سی تھیں، تو پھر اسے کہاں ڈھونڈا جائے۔

"اور ہم میں سے ہر کوئی بھی تو اسی جیسا ہے۔"

"تو ......"

ایک کو لگا اس کا دم گھٹ رہا ہے، دوسرے کو بھی یہی احساس ہوا۔

"ہم بھی تو کہیں نہیں مر رہے؟"

"اور ہمارے جنازے ......"

شہر کا شہر ہی ایک جنازہ تھا اور کہیں گم ہو گیا تھا۔

"شہر بھی کہیں گم ہوتے ہیں؟"

"کبھی کبھی ہو بھی جاتے ہیں۔"

"روشن دان اور دریچے بند ہو جائیں تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔"

"اور اندھیرے میں چیزیں گم ہو جاتی ہیں۔"

انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ نظر آیا، کچھ نظر نہ آیا، بس یہ لگا ایک بے قابو ہجوم ہے جو ہاتھ پیر مار رہا ہے، افسوس کے نعرے لگا رہا ہے اور پھولی سانسوں کے ساتھ سڑکوں اور گلیوں میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔

"ہم کسے تلاش کر رہے ہیں؟" ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" دوسرے نے قدرے تلخی سے کہا۔

"نہیں مجھے نہیں معلوم، اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"ہم ......" دوسرے نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا، لیکن لفظ نامکمل رہ گئے "ہم کسے تلاش کر رہے ہیں۔" اس نے خود سے سوال کیا مگر اسے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، اس نے کن انکھیوں سے پہلے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔

سوال کرنے والا کچھ دیر تو چپ رہا، پھر اس نے یہی سوال کسی اور سے کیا،

لیکن وہ بھی کوئی جواب نہ دے سکا، الٹا سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کسے تلاش کر رہے ہیں۔

''اب تو یاد بھی نہیں رہا۔'' ایک نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا ''ہم نکلے کب تھے اور کس لیے، تمہیں کچھ پتہ ہے۔'' اس نے ساتھ والے سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''شاید اسی کو پتہ تھا، جس کا جنازہ وہ ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''تو سارا اتہ پتہ وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔'' ایک نے دوسرے سے کہا۔

''اور خود بھی گم ہو گیا۔'' دوسرا ہنسا۔

''تم ہنسے کیوں؟'' پہلے نے دوسرے کو گھورا۔

''ہنسی آئی، ہنس پڑا۔'' دوسرے نے اسے گھورا ''تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔''

''میں''

''ہاں تم''

میں تم --- تم میں --- دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے، سارا ہجوم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گیا۔ سڑکوں، گلیوں اور گھروں میں سب ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ جو جس کے ہاتھ میں آیا، اٹھا کر دوسرے کو مارنے دوڑ پڑا۔ چیخیں، سسکیاں، آہیں، کسی کو کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی کو کسی کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی، ایک ہنگامہ تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ شہر کا شہر میدانِ جنگ بن گیا تھا، شہر سے باہر قبرستان میں گورکن تازہ کھدی ہوئی قبر کے کنارے بیٹھا بار بار شہر سے آنے والے راستے کو دیکھے جا رہا تھا۔ قبر کھدے دیر ہو چکی تھی اور قبر ایک بار کھد جائے تو کسی نہ کسی کو اس میں دفن ہونا ہی ہوتا ہے۔

شہر میں ہنگامے اب اپنے عروج کو پہنچ چکے تھے۔ سڑک کے کنارے پڑا جنازہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ اس میں سے اٹھنے والی بُو کسی کو محسوس ہو رہی تھی!!

~~~~~~~
~~~~~~~

اپنے ہونے کا احساس

اُس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ---

''میں سمجھنا چاہتا ہوں لیکن میرے لفظ معنوں سے خالی ہیں، اے رب مجھے لفظ عطا کر، عطا نہیں کرنا چاہتا تو لفظ ادھار ہی دے دے۔''

مرشد نے پسندیدگی میں سر ہلایا اور بولا --- ''لفظ سے زیادہ خیال اہم ہے کہ خیال شدّتِ توجہ سے واقعہ بنتا ہے اور واقعہ بے توجہی سے خیال ہی رہ جاتا ہے۔''

اس نے پوچھا --- ''تو پھر لفظ کہاں ہیں؟''

مرشد نے کہا --- ''لفظ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، تم نے سنا نہیں کہ جذبے کی اعلیٰ ترین سطح پر لفظوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔''

اس نے سر ہلایا --- ''شاید یہ وہی مقام ہے جہاں مَن و تُو کا جھگڑا مٹ جاتا ہے۔''

مرشد مسکرایا --- ''سمندر میں اترتے ہوئے مَیں ہوتا ہے لیکن سمندر کی گہرائیوں میں پہنچ کر سب کچھ سمندر ہو جاتا ہے۔''

اس نے کہا --- ''لیکن سمندر صرف اسے قبول کرتا ہے جو زندہ ہو۔''

مرشد نے تبسم کیا --- '' سمندر زندہ کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور مردہ کو باہر پھینک دیتا ہے۔''

دونوں چل پڑے، چلتے چلتے ایسے نقطہ پر پہنچے جہاں خود کو سنبھالنا مشکل ہی

نہیں ناممکن تھا، کوئی شے انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی، بلا رہی تھی۔

اس نے پوچھا --- "یہ کیا مقام ہے؟"

مرشد نے جواب دیا --- "یہ بلیک ہول کا آغاز ہے، ہم اس کے اندر جا رہے ہیں، شاید جا نہیں رہے لے جائے جا رہے ہیں۔"

اس نے سوچا --- "یہ بلیک ہول کیا ہے؟"

مرشد نے اس کی سوچ سن لی، بولا --- "بلیک ہول ایسی جگہ ہے جہاں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قوت اپنی ہی اسیر بن جاتی ہے۔"

ایک تنگ تاریک راستے سے گزر کر وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں وقت ٹھہرا ہوا تھا، وقت کے ٹھہرنے کا یہ منظر عجب تھا، مکاں منجمد ہو گیا تھا۔ وہ جانے وہاں کتنا عرصہ رہے، شاید دن یا صدیاں --- وہاں سے نکلنے کا رستہ نہ تھا، ایک عجب لذت تھی، ساکن ہونے کا بھی اپنا ایک منظر ہے۔

بہت دیر کے بعد مرشد کی آواز آئی --- "یہاں ہر شے دوہرائی جا رہی ہے۔"

اس نے دیکھا --- اگلے نقطہ پر آوازوں اور تصویروں کی ایک بھیڑ ہے۔

وہ اپنی آوازوں اور تصویروں کو تلاش کرنے لگا، اور ایسا کھویا کہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا، یہاں وقت شاید ٹھہرا ہوا تھا، یا شاید چل رہا تھا، اسے تو اندازہ ہی نہ ہوا۔ مرشد نے آکر اسے جھنجھوڑا --- آگے کوئی اور منظر تھا، منظر کے بعد منظر، سب منظر ایک دوسرے کے قیدی تھے۔

"یہ کیا طلسم ہے؟" اس نے مرشد سے پوچھا۔

"یہ ایسا طلسم ہے جہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں۔"

اس نے سوالیہ انداز سے مرشد کو دیکھا۔

مرشد بولا --- ''یہاں اتنی توانائی ہے کہ ہر شے اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے اور اس کا اپنا آپ بھی اس کا رہن ہے۔''

اسے کچھ سمجھ آیا، کچھ نہ آیا، کہنے لگا --- ''لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟''

مرشد ہنسا --- ''ہم شے نہیں، تصور ہیں اور عکس پابند نہیں ہوتا''

اور انہوں نے وہاں سے نکلنے کی سعی کی۔ مرشد تو پَر پھیلا یہ جا وہ جا، اسے البتہ دقت ہوئی، جہاں ہر شے اپنا وجود کھو دے، وقت ٹھہر جائے اور مکاں کی کوئی حیثیت نہ رہے وہاں سے نکلنا اتنا آساں تو نہ تھا، وہ جتنا اٹھا تھا اتنی ہی تیزی سے نیچے آیا۔

نیچے گرتے گرتے اس نے مرشد کو پکارا، مرشد جو کہیں دور نکل گیا تھا، اس کی آواز سن کر لوٹا اور بولا --- ''کیا تم ہو''

اس نے جواب دیا --- ''ہاں میں ہوں''

''تو پھر نکل چلو کہ یہاں وہی ختم ہوتا ہے جسے اپنے ہونے کا احساس نہ ہو، تمہارا احساس ابھی زندہ ہے، اس کے ختم ہونے سے پہلے نکل چلو۔''

مرشد کی آواز نے اسے حوصلہ دیا، اس نے اپنے ہونے کا احساس کیا اور اٹھا، اٹھا اور ایک جھٹکے سے باہر آ نکلا۔

''مبارک ہو'' مرشد ہنسا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ دونوں کائنات کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ ٹھہرا ہوا وقت پھر رواں ہو گیا تھا۔ مکان بھی وجود میں آ گیا تھا۔ وہ پہلے سیدھا چلا، وقت سیدھا تھا، اس کا کوئی آغاز انجام نہ تھا، پھر وہ زاویوں میں مڑا، وقت زاویوں میں آغاز و انجام سے بے نیاز تھا۔

''کیا یہ ازل سے پہلے موجود تھا'' اس نے مرشد سے پوچھا۔

''ابد کے بعد بھی موجود رہے گا'' مرشد نے جواب دیا۔

وہ جھنجھلا کر بولا---'' میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک نئی بات۔''

مرشد نے کہا---''نئی بات نہیں، تمہارے سوال کا جواب ہے۔''

''یہ کیسا جواب ہے؟''

مرشد بولا---''غور کیا کرو، تم نے غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

اس نے غور کیا اور اداس ہو گیا۔

''اداس کیوں ہو؟'' مرشد نے پوچھا۔

''واپسی کے بعد مجھے خوف آنے لگا ہے۔''

''کیسا خوف؟''

''وہاں سے تو نکل آئے لیکن یہ میرے آس پاس جو چلتے پھرتے بلیک ہول ہیں ان سے کیسے بچوں''

مرشد نے سر ہلایا---''یہ تو خود مردہ ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے اندر کھینچ کر مردہ کر دیتے ہیں۔''

''تو پھر''

''کچھ نہیں'' مرشد بولا---''اپنے ہونے کے احساس میں مگن رہو، اپنے ہونے کا احساس تمہیں ہر بلیک ہول سے بچائے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن بے اطمینانی کے اس پرندے کو نہ اُڑا سکا جو دیر سے اس کے دل کی چھتری پر بیٹھا ہوا تھا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

ایک دن اور

ناشتہ کرتے ہوئے حسبِ معمول اس نے اخبار کھول کر وفاتیات کے کالم پر نظر ڈالی اور اس میں اپنا نام نہ دیکھ کر ایک کلکاری بھری اور اپنے آپ سے کہا ---- ''چلو ایک دن اور سہی''۔ لیکن اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر جو ایک نیم گرم لہر سی دوڑی ہے، اس میں اور اس جملے میں کوئی ربط نہیں۔ روزانہ کا یہ رسمی سا جملہ اسے بے معنی سا لگا۔ 'ایک دن اور سہی' کے کیا معنی ہیں؟ کچھ دیر بعد، ابھی اور کچھ دیر پہلے کے اب اس کے نزدیک کیا معنی ہیں، سب کچھ تو ایک سا ہے، سو بعد، پہلے اور اب میں کیا فرق ہے؟ شاید کبھی تھا، اس نے حسرت سے سوچا اور رنگ برنگ لمحوں کا عکس ایک پل کے لیے لہرایا اور اس نے ان کے ہلتے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔

کیا آغاز تھا؟ اس نے سوچا۔ اُتھرے گھوڑے کی ٹاپوں سے زمین لرز رہی تھی اور اس کے زمین سے ٹکراتے سموں سے بجلی اُڑتی تھی، کالج کیفے ٹیریا میں بحث کرتے منہ سے جھاگ اٹھتی، بند مٹھیوں سے میز بجاتے ہوئے، دنیا بھر میں انقلاب لانے کے خواب، اس زمانے میں وہ سبھی ایک جیسے تھے، مستقبل کے دھندلکوں سے بے نیاز، اپنی ذات تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتی تھی۔ بس ایک خواب تھا، جس کی سرمئی دھند انہیں اپنے اندر جذب کیے ہوئے تھی۔ اس سرمئی دھند میں، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ محوِ رقص تھے۔ ایک والہانہ، مجذوبانہ رقص، ایک ایک عضو تھرک رہا تھا، آس پاس سے بے نیاز، اپنی دنیا میں گم اسی رقصِ مستانہ میں گم کالج سے یونیورسٹی کا سفر

بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ بھلے دن تھے، نوکری کے لیے بھی زیادہ تگ و دو بھی نہ کرنا پڑی۔ دو ایک جگہ انٹرویو دیا، اور ایک زنجیر گلے میں پڑ گئی۔ سارے لوگ وقتی طور پر بکھر گئے۔ لیکن شام کو اسی پرانے ہوٹل کی بوسیدہ سی میز پر اکٹھے ہوتے اور وہی خواب، دنیا کو بدل دینے کا خواب انہیں اپنی بُکل میں لپیٹ لیتا، رات گئے گھر لوٹ کر کچھ دیر پڑھنا، صبح وہی معمول اور شام کو اسی طرح ادھوری بحث کے سِرے جوڑ کر گفتگو کا آغاز۔

رنگ برنگے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور سرسراتے لمحوں کے درمیان احساس ہی نہ ہوا کہ سرسبز میدان کا راستہ کب اور کہاں ختم ہوا اور ناہموار کٹی پھٹی کانٹوں بھری زمین کہاں سے شروع ہوئی۔ ذرا ہوش آئی اور آنکھ کھول کر دیکھا تو سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا، شام کی محفلیں بھولی بسری داستانیں بن گئیں۔ دنیا بھر میں انقلاب لانے کا خواب، خواب ہی رہ گیا اور ساری دنیا کی بجائے اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

دونوں میاں بیوی ملازمت سے فارغ ہو کر گھر آتے تو بچوں کی پڑھائیکا مسئلہ شروع ہو جاتا۔ لگتا خود سکول میں داخل ہو گئے ہیں، ٹیں ٹیں، رِیں رِیں کرتے بچے چھلانگیں مارتے ایک کلاس سے دوسری کلاس میں پہنچتے گئے اور خود ان کے سروں میں چاندی کھلنے لگی۔

''پتہ نہیں وقت کیسے گزر گیا۔'' وہ کبھی کبھی اپنے آپ سے سرگوشی کرتا ---
''کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ لمحوں کو پنکھ لگے ہوتے ہیں، وہ تو بس اُڑتے ہی رہتے ہیں، اُڑتے چلے جاتے ہیں۔''

کبھی کبھی لمحہ بھر کے لیے یکسوئی کا کوئی پَل میسر آ جاتا تو لمحوں کے پنکھ ہلنے

کی آواز سنائی دے جاتی اور پھر وہی شور، زندگی کی ہماہمی کا نہ ختم ہونے والا بے ہنگم شور، یہ شور ایک سیلِ بلا کی طرح ہر شے کو بہائے لیے جاتا۔ وہ بھی ایک بے بس تنکے کی طرح اس کی زد میں تھا اور آگے ہی آگے چلا جاتا تھا۔

''زندہ رہنے کے لیے کتنی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔'' وہ سوچتا اور اسے پتہ نہ چلتا کہ اس کا یہ سوچنا کوئی تأسف ہے یا رواروی۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اس کے باپ کی زندگی اتنی تیز رفتار نہ تھی، وہ کتنا شانت ہوتا تھا۔

''شاید اس وقت دوڑ اتنی تیز نہ تھی اور ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی ایسی جلدی بھی نہ تھی، لیکن اب ....''

اس سے آگے سوچنا منع تھا، وہ تو خود کیوں کو دھکا دے کر آگے نکلا تھا اور اب اس کے بچے ----

''یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔'' اس کا بیٹا اسے سمجھاتا --- ''تیز رفتار، ٹو دی پوائنٹ''

وہ جواباً کچھ نہ کہتا۔ اس کا دور یوں بھی اب ختم ہو گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب اس کی مصروفیات یہی رہ گئی تھیں کہ بازار سے سودا لے آئے اور بیل بجے تو دیکھ لے کون آیا ہے۔ صبح جلدی اٹھنے کی پرانی عادت تھی، ناشتے سے پہلے ہی اخبار، اور اب کچھ عرصہ سے اخبار میں سب سے پہلے وفاتیات کے کالم پر نظر ڈالنا، اپنا نام نہ دیکھ کر --- ''ایک دن اور سہی'' کا وِرد کرنا۔ لیکن اسے یہ پتہ نہ چلتا کہ اس 'ایک دن اور سہی' میں مفاہمت ہے، مجبوری یا خوشی۔ خوشی تو شاید نہیں تھی، بس ایک مجبوری اور مفاہمت --- چلو ایک دن اور سہی۔

اس ایک دن اور کے لیے ہر صبح وفاتیات کا کالم دیکھنا، صبح جلدی اٹھنا، صبح جلدی اٹھنے کی عادت تو تھی ہی لیکن ایک صبح وہ ذرا دیر سے اٹھا۔ رات کو طبیعت ٹھیک

نہیں تھی۔ نیند دیر سے آئی، یوں بھی اگلے دن ہفتہ وار تعطیل تھی۔ سب گھر میں تھے۔ وہ ذرا دیر سے اٹھا، خیال آیا کہ اخبار تو دیکھا ہی نہیں، لاؤنج کی طرف آیا لیکن دروازے ہی میں ٹھٹک گیا، اس کا بڑا بیٹا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ---''چلو ایک دن اور سہی'' اور اس کے سامنے وفاتیات کا کالم کھلا ہوا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس کا باپ اَسّی سال کی عمر میں بھی مرنے کا ذکر سننا پسند نہیں کرتا تھا، مگر اس کا بیٹا جوانی ہی میں وہاں پہنچ گیا ہے جہاں وہ خود ستر سال میں پہنچا ہے۔ اس نے سوچا ---

''پتہ نہیں، یہ ترقی ہے، تیز رفتاری یا ٹو دی پوائنٹ......؟''

~~~~~~~
~~~~~~~

خزاں دبے پاؤں آئی

خزاں ایسے چپکے چپکے اور دبے پاؤں آئی کہ احساس ہی نہ ہوا کہ پیلاہٹوں کی کھلکھلاہٹ میں ایک مضمحل سی خاموشی آتی چلی جا رہی ہے۔ یہ دن شاید ایسے تھے کہ ناچتے گاتے رنگوں کی کھنکناہٹ میں ایک اداسی سی در آنے کی طرف خیال ہی نہیں جاتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہی تھا، مستانی ہواؤں میں جھومتی شاخیں اور شاخوں پر گیت گاتے پرندوں کے گھونسلے، بس یہیں کہیں احساس ہوا ہے کہ آہستہ آہستہ کچھ ہو رہا تھا، اندر ہی اندر، چپکے ہی چپکے۔ گھونسلے خالی دکھائی دینے لگے تھے۔ ذرا سوچا، دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر خالی پڑے ہیں۔ ''تو پرندے کدھر گئے۔'' اس نے حیرت سے اپنے آپ سے پوچھا۔ اب ذرا اور غور کیا تو معلوم ہوا کہ باغ میں تو اب ایک بھی فاختہ نہیں، کوئل نہیں، مدھر گیت گانے والے رقص کرنے والے سارے پرندے جانے کب سے ہجرت کر رہے تھے۔ شاید ایک ساتھ ہی چلے گئے ہوں یا ایک ایک کر کے رخصت ہوئے ہوں، باغ میں تو اب ایک بھی سریلی آواز نہیں تھی، بس کوّوں کا بے ہنگم شور تھا یا درختوں کی اونچی چوٹیوں پر بیٹھی چیلیں تھیں جن کی صورتیں گدھوں جیسی ہو گئی تھیں۔

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''تو میں ان بے ہنگم آوازوں میں زندہ ہوں، اور مجھے احساس ہی نہیں کہ یہاں کا سریلا پن تو رخصت ہو گیا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا --- ''کب سے؟'' اسے اپنے آپ پر غصہ آیا ---

''ایک ایک سریلی آواز مرتی گئی اور مجھے پتہ نہیں چلا۔''

اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر ایسے گرائے جیسے اپنے آپ کو کوس رہا ہے۔

''جانے یہ کب سے ہو رہا ہے؟ ایک ایک محبت کا گیت گانے والا رخصت ہو گیا اور یہ بے ہنگم کوے سارے باغ پر چھا گئے؟'' اس نے درختوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھا --- ''اور یہ گدھ نما چیلیں آ گئیں۔''

لمحہ بھر کے لیے لگا وہ سب اس پر ٹوٹ پڑی ہیں اور اس کی بوٹی بوٹی نوچ رہی ہیں۔ درد کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ نکل پڑی۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا --- ''چیلیں گدھ بن گئی ہیں۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا --- ''کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ساری فاختائیں، ساری بلبلیں، سارے گیت گانے والے پرندے کوے بن گئے ہوں۔''

اس نے جھومتی شاخوں پر ویران گھونسلوں کی طرف دیکھا، ان کی مدھرتا تو اب ختم ہو چکی تھی اور کوے ذرا اوپر والی شاخوں پر اپنی بے ہنگم آوازوں کے ساتھ اپنے ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اب اس نے باغ کی طرف دیکھا، پھول مہک تو رہے تھے، لیکن کوئی پراسرار خاموشی تھی کہ اس مہک میں لہک نہیں تھی۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ پھول مہک ہی نہ رہے ہوں اور صرف مجھے لگ رہا ہو کہ مہک رہے ہیں۔ شاید نہیں بھی کھلے، خوشبو تو ہے پر شاید نہیں ہے۔''

کچھ گڑبڑ ضرور تھی کہ دکھائی تو سب کچھ دیتا تھا، سنائی بھی دیتا تھا، لیکن کہیں کوئی گہری خاموشی بھی دبکی بیٹھی تھی، اس بلّی کی طرح جو کبوتر کو دبوچنے کے لیے دبے پاؤں، دبے پاؤں، سانس روک کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے، کبھی اوٹ میں

ہو جاتی ہے اور کبھی --- اور خاموشی بھی یہی کر رہی تھی اور اس خاموشی کے پیچھے پیچھے خزاں، بلّی سے بھی آہستہ چلتی --- چلی آ رہی تھی، جانے کب سے؟

''مجھے کچھ احساس ہی نہیں۔'' اسے ایک عجب سی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوا۔

''اور یہ سارا باغ، کسی کو معلوم نہیں کہ فاختائیں اور بلبلیں یہاں سے جا چکی ہیں۔ اب یہاں صرف کوّے اور چیلیں ہیں۔''

لمحہ بھر کے لیے خیال آیا شاید آہستہ آہستہ ان کی کایا کلپ بھی ہو رہی ہے، کوّے چیلیں بن رہے ہیں اور چیلیں گِدھوں میں ڈھل رہی ہیں، دفعتاً اسے ایک خوفناک سا خیال آیا کہ بس --- لگا وہ نیم جان باغ کے بیچوں بیچ پڑا ہے، گِدھ اوپر منڈلا رہے ہیں، ابھی ان میں سے کوئی ایک غوطہ لگائے گا اور پھر --- اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لگا گِدھ اس کے جسم کا کوئی ٹکڑا نوچ کر لے گیا ہے --- ایک اذیّت، بے بسی --- لیکن اس بے بسی میں تأسّف تو تھا، دکھ کا احساس نہیں تھا، اور تأسّف بھی کیا تھا، بس ایک بے نام سی حِس تھی کہ کبھی وہ تھا، لیکن اب ہے بھی تو نہیں۔ تأسّف کا احساس بھی ایک نعمت ہے اور وہ تو اب اس نعمت سے محروم ہو چکا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے خیال ہے --- ''تعجب بھی نہیں کہ یہ کچھ ہو گیا اور مجھے خبر نہ ہوئی۔''

''شاید اندر ہی اندر، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح مجھے معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہونے جا رہا ہے، لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔ باغ پرندوں سے خالی ہوا جا رہا ہے اور مجھے احساس نہیں ہوا۔''

اس کے اندر کہیں کوئی چور ضرور تھا، اور وہ اس چور کو جانتا بھی تھا لیکن

آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور میں اس سے بے خبر ہوں۔''

لیکن یہ بے خبری بھی عجب شے ہے، اس بے خبری نے فاختاؤں، بلبلوں اور دوسرے نغمہ سنج طیور کو کوّوں اور چیلوں میں بدل دیا تھا --- اتنی بڑی کایا کلپ۔

دفعتاً خیال آیا کہ یہ پھول بھی پھول ہیں، اور یہ خوشبو بھی خوشبو ہی ہے نا --- کہیں یہ بھی تو ---

اس نے آنکھیں مَل مَل کر دیکھا۔ پیلاہٹیں تو پھیل رہی تھیں اور دیمک کی طرح سارے باغ کو اپنی بُکل میں سمیٹ رہی تھیں، اس کی نظریں زمین کی طرف گئیں۔

یہ کیا --- زمین پر تو چیونٹیوں اور مکوڑوں کا ایک جال سا بُنا جا رہا تھا۔ درختوں کے تنوں، پھولوں کی ٹہنیوں اور تنوں پر وہ ایسے دوڑ رہی تھیں جیسے سب کچھ فتح ہو گیا ہے۔

''شاید جڑوں میں بھی ......'' اس نے سوچا۔

''تو باغ اب صرف دکھائی دے رہا ہے لیکن اصل میں ہے نہیں، ہے بھی تو بس تھوڑی دیر کے لیے، اس کے بعد ......''

اس خیال ہی سے اسے جھرجھری آ گئی۔ ایک تیز اور درد بھری لہر نے جیسے اس کے سارے وجود کو کاٹ دیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ باغ ......'' لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

دفعتاً پنڈلی سے درد کی ایک لہر اٹھی اور اس کے سارے وجود میں پھیل گئی۔

اس نے ہڑبڑا کر دیکھا، چیونٹیاں، مکوڑے اس کے پاؤں سے ہوتے ہوئے سارے وجود پر پھیل رہے تھے۔ جگہ جگہ سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے انہیں جھاڑنے کی کوشش کی لیکن چند ہی لمحوں میں انہوں نے اس کے سارے بدن کو ڈھانپ لیا۔ درد کی شدت سے وہ زمین پر گر پڑا اور لوٹ پوٹ ہو گیا۔ چند لمحے --- یا کئی لمحے یا اس سے بھی زیادہ --- اسے لگا وہ تیزی سے سکڑ رہا ہے، چہرے پر ایک کھچاؤ سا آ رہا ہے اور کوئی چیز ابھر رہی ہے، نیم وا آنکھوں سے، ہاتھوں سے جو اب پنجوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا --- چونچ نکل آئی تھی اور کندھے سکڑ کر پروں کی صورت اختیار کر گئے تھے --- وہ کوّا بن گیا تھا۔

اس نے چند لمحے اپنے آپ کو دیکھا، پھر درختوں کی اونچی ٹہنیوں پر بیٹھی چیلوں پر نظر ڈالی اور بولا ---

"شکر ہے...... شکر ہے، میں چیل نہیں بنا، کوّا بن گیا ہوں، شکر ہے، شکر ہے۔"

اور اڑ کر ایک خالی ٹہنی پر جا بیٹھا اور دوسرے کوّوں کے ساتھ مل کر کائیں کائیں کرنے لگا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

دمِ واپسیں

دن کے آخری ایوانوں کی سیڑھیوں سے اترتے شام کے سائے لمبے اور گہرے ہوئے جا رہے تھے۔ روشنی کی آنکھوں میں سرمئی دھند پھیل گئی تھی اور ایک ہلکی سی دھندلاہٹ نے اس کی چمک کو ماند کر دیا تھا۔ شام کی تھاپ پر تھرکتی خاموشی کے پاؤں میں بجتے گھنگھروؤں کی تھرتھراہٹ بڑھتی جا رہی تھی، اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، گھونسلوں میں جانے سے پہلے پرندے آخری اڑانیں بھر رہے تھے اور ایک ایک کر کے درختوں کی گھنی شاخوں میں اتر رہے تھے۔

''تھوڑی دیر کے بعد یہ اپنی چونچوں کو پَروں میں واپس دبا کر خاموشی کی چادر اوڑھ لیں گے۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ آنکھیں بند ہونے اور اندھیرا گہرا ہونے کے تصور ہی سے اس کے سارے وجود میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ ساری عمر وہ اندھیروں سے ڈرتا رہا تھا، مگر اب ---- عمر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے قدم زمین پر لگنے ہی والے تھے، ایک ٹھنڈی تاریک زمین جو اسے ایک ڈراؤنے اندھیرے خلا کی سی لگتی تھی۔ معلوم نہیں، اس خلا کا انت کیا ہے۔

''یقین بھی اک عجب دولت ہے۔'' اس نے سوچا۔ وہ ہمیشہ اس دولت سے محروم رہا تھا، رسے پر ڈولنے کی کیفیت، اِدھر کیا ہے اور اُدھر کیا ہے، بس ساری زندگی اسی ادھیڑ بُن میں گزر گئی۔ اور اب آگے تو ایک نامعلوم دنیا تھی۔ اس نامعلوم دنیا کو دیکھنے کی تمنا ہمیشہ اس کے اندر انگڑائیاں لیتی رہی اور اب جب وہ اس اَن دیکھی دنیا کی جانب قدم قدم بڑھ رہا تھا تو ایک عجب طرح کا خوف دبے پاؤں

پیچھے پیچھے چلا آتا تھا ---- آگے کیا ہے، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں تو پھر ---- اس خیال ہی سے کانپ سا جاتا۔ میں ختم ہو جاؤں گا، کھیل ختم ہو جائے گا۔

کھیل کے ختم ہو جانے کا احساس بہت ہی تکلیف دہ تھا، لیکن عمر بھر اس نے کوئی عمدہ کھیل کھیلا بھی نہیں تھا، بس ایک سادہ سی تحریر، سادے سے اوراق پر۔ درمیانے طبقے کے ایک آنگن میں کھلا تو وہ پھول کی طرح تھا، لیکن اس پھول کی مہک زیادہ دنوں برقرار نہ رہی۔ زندگی کی طویل تپتی سڑک پر چلتے چلتے تھکن کب اس کے وجود کی گلیوں میں داخل ہوئی، اسے اس کا احساس ہی نہ ہوا۔ بس یوں لگا جیسے کسی ایک دن وہ تھک سا گیا ہے۔ اس احساس نے اس پر ایک جھلاہٹ سی طاری کر دی۔ اس کی بیوی اس جھلاہٹ سے بہت چڑتی تھی ----

''اور کیا چاہتے ہو، بیٹیوں کی شادی ہو گئی، لڑکے اپنے اپنے کام سے لگ گئے، عزت سے ریٹائر ہو گئے، گھر بن گیا .... اور تم کیا چاہتے ہو؟''

یہ تو اسے بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اور کیا چاہتا ہے۔ لوگ اسے خوش نصیب کہتے تو لگتا طنز کر رہے ہیں، لیکن پھر خود سے پوچھتا ----

''واقعی میں کیا چاہتا ہوں۔''

دن کے ایوانوں کی آخری سیڑھیوں سے اترتے شام کے لمبے سایوں میں اب اندھیرا گھلنے لگا تھا، فضا میں اڑتے پرندے آہستہ آہستہ گھنی شاخوں میں چھپے اپنے گھونسلوں میں اتر رہے تھے، فضا صاف سی ہونے لگی تھی، اب کچھ دیر بعد پرندے اپنی چونچیں اپنے پروں میں چھپا لیں گے۔

اس نے اپنے سامنے پھیلی سڑک پر نگاہ ڈالی۔ آگے ایک موڑ تھا، اس کی سیر کا آخری نقطہ۔ اس موڑ سے واپسی ہوتی، خاموشی سے گیٹ کھول کر اپنے کمرے

میں جانا، تھوڑی دیر بعد بیوی میز پر چائے رکھ جاتی، گھونٹ گھونٹ چائے پیتے بس خاموشی سے دیواروں کو گھورے جانا۔ کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے نئے نئے خیالات اس کے ذہن میں اترتے، جیسے کبوتر آسمان کی پہنائیوں سے ہوتے ہوئے اپنی چھتری پر اترتے ہیں۔ اس وقت اسے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ موڑ سے واپس آ جاتا ہے، آگے جانے اور موڑ سے پَرے دیکھنے کی خواہش تو بہرحال ہمیشہ اس کے اندر رہی لیکن وقت کی طنابیں اتنی کسی ہوئی تھیں کہ بس تھوڑی سی دیر کے لیے سوچا ہی جا سکتا تھا، پھر وہی ہاؤہو۔ اور اسی ہاؤہو میں آہستہ آہستہ سب کچھ ہوتا گیا۔

بیٹیوں کی شادیاں بھی ہو گئیں، لڑکے پڑھ پڑھا کر اپنے اپنے دھندوں میں پھنس گئے اور اس کی ریٹائرمنٹ کا لمحہ آن پہنچا، کئی دن تو یہ سمجھنے میں لگ گئے کہ اب صبح سویرے تیار ہو کر دفتر جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے مزاج میں مفاہمت کا جو پہلو تھا، اس نے یہاں بھی اس کا ساتھ دیا۔ چائے پی کر دیر تک اخبار دیکھا، پھر بازار جا کر کچھ خرید لانا، مصروف رکھنے کی کوئی نہ کوئی صورت روز ہی پیدا ہو جاتی۔ اب فرصت کے ان لمحات میں ایک لذت سی محسوس ہونے لگی۔ نوکری کے طویل عرصہ میں بیوی کے ساتھ بات کرنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ صبح اٹھتے ہی تیاری، دن بھر فائلوں کا اِدھر اُدھر ہونا، شام کو تھکن، چائے کی پیالی اور پھر یہ سنسان سڑک، قدم قدم چلتے دفتر کے، فائلوں کے خیال، وہ چیز رہ گئی ہو گی، یہ چیز صبح جاتے ہی کرنا ہے، ان ہی الجھنوں میں موڑ آ جانا، واپسی پر کچھ دیر ٹی وی دیکھنا اور سو رہنا ----
"میں تو کولہو کا بیل ہوں" وہ اکثر اپنے آپ سے کہتا۔

یہ قدم قدم سیڑھیاں چڑھنے کے دن تھے، دور سے چمکتی چھت، آنکھیں مار

مار کر اپنی طرف بلاتی تھی۔ اس کے گرداگرد خیالوں، باتوں کے، تصورات کے دائرے رقص کرتے تھے، رات گئے تک کسی چائے خانے کی میز کے گرد دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ اپنی زندگی میں تبدیلیاں آ ہی رہی تھیں، ساری دنیا، ساری کائنات کو بدلنے کا خواب بے چین کیے رکھتا۔ جینے کی آسائشوں میں خود کو جاننے، پانے اور کبھی کبھار اپنے اندر اتر جانے کی تمنا اکثر چٹکیاں لیتی رہتی اور ان سب میں قدم قدم اوپر چڑھتے جانا، ہر سالگرہ پر ایک موم بتی کا اضافہ، پھر معلوم نہیں وہ کب چمکتی چھت پر پہنچا، کتنی دیر وہاں رہا، یا رہا بھی یا نہیں، اس کا احساس تو اس وقت ہوا جب دوسری جانب اترنے کا آغاز ہو چکا تھا، ایک روز آئینے کے سامنے کنگھی کرتے ہوئے پہلے سفید بال نے احساس کرایا کہ وہ نیچے اتر رہا ہے، دیکھا تو مونچھوں میں بھی دو ایک سفید سی لہریں گویا اپنے آپ کو کالے بالوں میں چھپا رہی تھیں، ''تو واپسی کا سفر شروع ہو گیا'' ---- اس نے اپنے آپ سے کہا، اور پھر شانے ہلا دیے ---- یہ تو ہونا ہی تھا۔ اب اس کی رفتار میں ذرا آہستہ خرامی آ گئی، کبھی کبھار زیادہ دیر تک بولتے رہنے سے سانس پھولنے لگی، اس دوران وہ دفتر میں بڑے سے اکیلے کمرے میں پہنچ گیا۔ اب صبح کچھ دیر بھی ہو جاتی تو بغیر کسی خوف کے گھر سے نکلتا۔ اس کا چپڑاسی بڑے گیٹ پر ہی منتظر ہوتا اور اس کے اترتے اترتے گاڑی میں سے بریف کیس نکال لیتا۔ ایک شاہانہ انداز سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ بڑے کمرے پر ایک نظر ڈالتا، کیف سے لبریز ایک نیم گرم لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ جاتی۔ قدم قدم نیچے اترنے کا احساس تک نہ ہوتا، لیکن جس دن وہ ریٹائر ہوا اسے لگا وہ ایک دم آخری سیڑھیوں تک آن پہنچا ہے، جس کے آگے ----

''یہ آگے کیا ہے، اس کی سیر کی آخری حد اور موڑ سے آگے، اس موڑ سے آگے کیا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ فضا اب پرندوں سے خالی ہو گئی تھی اور شام کے لمبے پھیلے سائے اندھیرے کی بُغل میں دبک گئے تھے۔ واپسی کا وقت ہو گیا تھا، لیکن یہ موڑ، اس موڑ سے آگے کیا ہے؟ کبھی تو ادھر جانا ہی ہے۔ اس نے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی، اب شاید سیڑھی کے چند ہی تختے رہ گئے تھے، اس کے بعد اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرا خاصا گاڑھا ہو گیا تھا۔ شاید اس کے بعد کچھ ہو، شاید نہ ہو --- شاید ایک عجب طرح کی تھکاوٹ سی، جس میں نشہ سا تھا، اس کے سارے وجود پر رینگ رہی تھی۔

''شاید میں آج کچھ تیز چل رہا ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا، ایک مست کر دینے والی غنودگی نے اسے تھپکنا شروع کر دیا، ایک شفیق مہربان ماں کی طرح جو اپنے بچے کو گود میں ہلا ہلا کر لوری سناتی ہے، ایک گیت جس کے بول واضح نہ تھے، لیکن اس کے سُر اس کے سارے بدن پر گدگدیاں کر رہے تھے۔ اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ آئی، لگا جیسے وہ یکدم دو چار زینے نیچے اتر گیا ہے۔ خیال سا آیا کہ اس سڑک پر ایک درخت کے نیچے پتھر کا ایک ٹوٹا سا بنچ ہے۔ جانے کب سے وہاں پڑا کسی کے بیٹھنے کا منتظر، وہ روز آتے جاتے اسے دیکھا کرتا تھا، ''معلوم نہیں اسے یہاں کس نے رکھا ہے؟'' اس نے کئی بار سوچا تھا۔

اس سرمئی نیم غنودگی میں اسے لگا یہ بنچ اس کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس خیال سے اسے ایک سرور سا آیا، اس نے نیم کھلی غنودہ آنکھوں سے بنچ کو دیکھا اور آہستگی سے اس پر بیٹھ گیا۔ بنچ کی کمر ابھی سلامت تھی، اس نے اپنی کمر کو ٹیک دیا اور ایک لمبا سانس لے کر فضا میں دیکھا، فضا خالی تھی، سڑک بھی دور دور تک ویران، ایک

پراسرار خاموشی، اندھیرے اور سرشاری کی لذت میں لپٹی ہلکی ہلکی ٹھنڈ دائرہ بنائے اس پر جھکی ہوئی تھی۔

اس رات جب وہ دیر تک گھر نہ لوٹا تو اس کی بیوی نے بڑے بیٹے سے کہا ''گاڑی نکالو، تمہارے ابو ابھی تک نہیں لوٹے۔''

گاڑی کی روشنی میں وہ انہیں دور ہی سے بنچ پر بیٹھا نظر آ گیا۔ گاڑی روک کر پہلے بیٹا، پھر ماں باہر نکلے۔

''ابو جی ....'' بیٹے نے اسے چھوا تو وہ آہستگی سے ایک طرف کو گر گیا۔

ماں بیٹا دونوں کے منہ سے ایک ساتھ چیخ نکلی لیکن وہ نہ سن سکا کہ وہ تو کبھی کا موڑ مڑ چکا تھا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

عکسِ دیدۂ چراغ

گھر سے باہر رہنے کا تصور اتنا ہی تھا کہ صبح جا کر شام کو واپس آ جانا، رات گھر سے باہر گزارنے کے خیال ہی سے ہول اٹھتا۔ رات گھر سے باہر رہنے میں اور تو کوئی قباحت نہ تھی، بس یہ تھا کہ وہ رات کو اکیلا نہیں سو سکتا تھا۔ دوست احباب اس کی بات سن کر ہنستے تھے لیکن وہ اکیلا سونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے ایسے ڈراؤنے خواب آتے، کبھی لگتا کوئی اس کے سینے پر سوار ہو گیا ہے۔ کروٹ بدلتا تو نادیدہ وجود اس کے کندھوں پر بیٹھ جاتا، چیخ بھی نہ نکلتی، محسوس ہوتا کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہے، مگر عجیب بات یہ تھی کہ کوئی شیر خوار بچہ بھی پاس لیٹا ہو تو یہ سارے خوف دور ہو جاتے اور وہ مزے سے سویا رہتا۔ اب معلوم نہیں یہ خوف کیسے اس کے وجود میں در آیا تھا، بہرحال اب تو موجود تھا، اور ایک زندہ حقیقت۔

کہیں شہر سے باہر جانا ہوتا تو وہ اس طرح پروگرام بناتا کہ شام ہونے سے پہلے لوٹ آئے اور اگر کبھی رات باہر رہنا پڑ ہی جاتا تو وہ کسی ایسے ریستوران کا انتخاب کرتا جو ساری رات کھلا رہتا، چائے پیتا رہتا، رات دبے پاؤں گزرتی رہتی، صبح کی پہلی کرن دروازوں پر دستک دیتی تو وہ اطمینان کا سانس لیتا۔ دفتری مصروفیات کی وجہ سے کبھی کبھی اسے دو دو تین راتیں اسی طرح گزارنا پڑتیں، سو اکثر شہروں میں اسے اس طرح کے ریستورانوں کا علم تھا جو ساری رات کھلے رہتے ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب تجربہ تھا، عام طور پر ایسی جگہوں پر شفٹوں میں کام کرنے والے کھانا کھانے یا چائے پینے آتے، کچھ لوگ گھر جانے سے پہلے آنا ضروری سمجھتے،

ادیبوں، شاعروں کی ایک جماعت بھی مستقل موجود رہتی، اخباروں میں کام کرنے والے بھی ایسے ریستورانوں میں دیر تک بیٹھتے، لیکن ایک وقت ایسا آتا کہ وہ رہ جاتا یا بیرے۔ ان کی تند و تیز نظروں سے بچنے کے لیے وہ وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ منگاتا رہتا، کچھ کھاتا، کچھ چکھتا اور کچھ چپکے سے نیچے پڑی ٹوکری میں پھینک دیتا، بہر حال رات کسی نہ کسی طور گزر ہی جاتی۔

بیوی اس کے خوف سے واقف تھی، اس لیے وہ کبھی میکے میں رات نہ گزارتی۔ شروع شروع میں البتہ کچھ تلخی پیدا ہوئی، لیکن ایک دن اس نے بیوی کو ساری بات بتا دی۔ پہلے تو وہ ہنس پڑی لیکن اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر متفکر ہو گئی اور بولی: ''اس کی کچھ تو نفسیاتی وجہ ہو گی، تم کسی اچھے ماہر نفسیات سے کیوں نہیں مل لیتے!''

وہ چپ رہا، اب اسے کیا بتاتا کہ یہ خوف اس کی ذات کا حصہ ہے اور ذات کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ خود اس نے اپنے طور پر کئی توجیہات کی تھیں، مگر بے سود، خوف تو اپنی جگہ تھا، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی تو کہیں نہیں جاتی۔ چنانچہ آسان طریقہ یہی تھا کہ باہر جانے کے مواقع ٹال جاتا، حالانکہ اس سے خاصا مالی نقصان بھی ہوتا۔ اس کے دوسرے ساتھی ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے کہ ٹی اے، ڈی اے ملنے کی صورت بنے۔ اس کے افسر بھی اب اس کی عادت سے واقف ہو گئے تھے اور اکثر اسے باہر بھیجنے سے گریز ہی کرتے تھے، لیکن اس بار دورے کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے جانا پڑا۔

خیال تھا کہ حسب معمول رات کسی ریستوران میں گزر جائے گی۔ میٹنگ کی جگہ شہر سے باہر تھی اور خاصی دور، اس کے ساتھ ہی گیسٹ ہاؤس بھی تھا۔ میٹنگ شام

تک چلتی رہی۔ اس نے چاہا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے شہر جا پہنچے، مگر معلوم ہوا کہ اس وقت شہر جانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اس کے لیے گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بک تھا۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے، مگر مرتا کیا نہ کرتا، کھانا کھا کر اسے کمرے میں جانا پڑا۔ کمرہ پُرآسائش اور آرام دہ تھا۔ ایک دروازہ باہر، دوسرا ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا اور بند۔ اس طرف کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔

اس نے خود کو تسلّی دی اور ٹی وی آن کر دیا۔ پروگرام دلچسپ تھے، وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا لیکن ایک بجے کے قریب نشریات ختم ہو گئیں۔ اس نے ادھر ادھر چینل تلاش کیے مگر یہاں کیبل یا ڈش تو تھی نہیں، سکرین پر کچھ نہ ابھرا، سائیں سائیں کی آواز نے اس کے وجود پر دستک دی۔ سونے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز دیواروں کو گھورنے لگا جن کی سفیدی میں سے ایک خوفناک ہیولیٰ ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتہً اسے خیال آیا کہ پلنگ کے نیچے کوئی چیز سرسرا رہی ہے، اچھل کر نیچے اترا، جھانکا، کچھ بھی نہ تھا۔ ساری بتیاں روشن کر دیں، لمحہ بھر کے لیے کمرہ جگمگا اٹھا۔ اس نے خود کو تسلّی دی، لیکن یہ صرف ایک لمحہ تھا، اس کے بعد اسی جگمگاتی روشنی میں سے کسی ان دیکھے وجود کے ابھرنے کا احساس ہونے لگا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی، لیکن اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے چیخ نکلتی، ساتھ والے کمرے کی طرف کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے کچھ سمجھ نہ آیا، دستک جاری رہی۔ ادھر کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا، سامنے ایک نوجوان مرد اور اسی عمر کی ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، نوجوان بولا:

''آپ نے بُرا تو نہیں منایا، دراصل ہم لوگ بور ہو رہے تھے، سوچا گپ

شپ لگائی جائے!'' اس نے دل ہی دل میں شکر کیا، اور بولا ......

''نہیں نہیں، میں خود بور ہو رہا تھا، آپ آیئے نا!'' وہ ایک طرف ہو گیا۔

''یہ میری بیوی ریحانہ ہے اور میں قدوس ہوں۔'' نوجوان اندر آتے ہوئے بولا۔

دونوں صوفے پر بیٹھ گئے، وہ بستر کی پائنتی پر ٹک گیا۔

''آپ آرام سے لیٹے رہیے۔'' ریحانہ بولی۔ وہ نیم دراز ہو گیا۔

''مجھے تو اکیلے میں بڑا ڈر لگتا ہے۔'' قدوس کہنے لگا۔

''یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی!'' خوشی کے مارے اس کے منہ سے لفظ نہ نکل رہے تھے۔ باتیں شروع ہو گئیں، دنیا بھر کی باتیں، گھروں کی باتیں، دفتروں کی، دوستوں کی ...... معلوم نہیں کب وہ اونگھ گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو ہشاش بشاش، وہ دونوں کب کے جا چکے تھے ......

''شاید میں سو گیا ہوں اور وہ چپکے سے چلے گئے ہوں!''

ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرتے ہوئے اس کے میزبان نے پوچھا ......

''رات تو آرام سے گزری؟'' پھر ہنستے ہوئے بولا ...... ''ڈر تو نہیں لگا؟''

''نہیں بالکل نہیں۔'' اس نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔ ''پڑوس والے کمرے سے قدوس صاحب اور ان کی بیگم آ گئے تھے۔''

''میزبان نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا ......

''ساتھ والے کمرے سے؟''

''جی ہاں، ساتھ والے کمرے سے، بڑے اچھے ہیں دونوں میاں بیوی۔''

میزبان لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا ...... ''لیکن ساتھ والا کمرا تو خالی ہے۔''

''خالی ہے!'' اس نے حیرت سے کہا .... ''لیکن قدوس صاحب اور

ان کی بیوی......''

''گزشتہ سال وہ دونوں اسی کمرے میں تھے، رات کو گیس کا ہیٹر کھلا رہ گیا تھا، بے چارے دونوں ....'' میزبان چپ ہو گیا۔

اسے ایک لمحہ کچھ سمجھ نہ آیا، پھر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آیا، اندر داخل ہوا، ساتھ والے کمرے میں جانے والے دروازے کی اس طرف والی کنڈی لگی ہوئی تھی۔

~~~~~~~
~~~~~~~

بکھری ہوئی کہانی

یہ کہانی یوں شروع ہوتی ہے اور سنانے والے سناتے ہیں کہ بہت برس بیتے ایک ٹھٹھری ڈراؤنی رات جب گاڑھا اندھیرا چیزوں کو سونگھتا پھر رہا تھا، وہ دبے پاؤں چوروں کی طرح وہاں آیا اور بڑی کرسی پر جو مدتوں سے خالی تھی، چپ چاپ بیٹھ گیا۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے سب سے اپنے ہونے کی گواہی لی اور خوشی کے اظہار میں سب نے اپنے لہو کا ایک تازہ پیالہ اس کی نذر کیا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ ہر سال اس ڈراؤنی رات میں آتا اور اپنے ہونے کی گواہی لے کر تازہ لہو کا ایک ایک پیالہ نذر کے طور پر قبول کرتا، اور کہانی یوں ہی آگے بڑھتی ہے اور سنانے والے سناتے ہیں کہ کئی سالوں بعد ان میں سے ایک نے اس کی گواہی دینے سے انکار کیا۔ اس سال ان کی فصلوں کو آگ لگی اور پانی کے چشمے سوکھ گئے۔

قبیلے کے سفید ریشوں نے اس شخص کو نافرمان اور منکر کہہ کر اعلان کیا کہ وہ اِن میں سے نہیں اور سب مل کر اجنبی کے پاس آئے اور اس سے التجا کی کہ تازہ لہو کے پیالے ٹھنڈے ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ آئے اور ان کی گرم باس سونگھے۔ اجنبی نے انکار کرنے والے کی بابت سوال کیا۔ قبیلے کے ایک سفید ریش نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ”اے خداوند! اسے ہم نے انکار کرنے والوں میں شامل کیا اور اپنے دروازے اس پر بند کر دیے۔“

اجنبی نے اس گفتگو کو مسرّت سے سنا اور ان کے ساتھ قبیلے میں آیا۔ قبیلے

کی خوبصورت کنواریوں نے اس کے آگے سر جھکائے۔

ایک شخص نے کہا: ''خدا نے ہم پر بڑا کرم کیا کہ آقا ہم پر مہربان ہوا۔''

پھر اس نے انکار کرنے والے کی خالی نشست کی طرف دیکھا۔ ''شکر ہے ہم نے اسے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔''

اجنبی کو یہ گفتگو بہت بھلی لگی۔ اس نے اس شخص کو پاس بلا کر سنہری سکوں کی تھیلی پیش کی۔ اس شخص نے تھیلی کو چوغہ میں چھپا لیا اور بولا: ''اے آقا! قبیلے کے سارے دروازے اس کے لیے حرام کر دیے گئے ہیں۔''

اور یہ کہانی یوں ہی جاری رہی۔

اس کے بعد ایک طویل چپ ہے۔

پھر سنانے والے سناتے ہیں کہ بعد ایک مدت کے اجنبی کا آخر وقت آن پہنچا۔ یہ جان کر کچھ لوگ بہت خوش ہوئے کہ اب ان کے کھیتوں کی ہریالی ان کے پاس رہے گی۔

اجنبی کا آخری لمحہ آن پہنچا۔

تب لوگوں نے دیکھا کہ عین اسی لمحہ جب اجنبی رخصت ہوا چاہتا تھا۔ اس کی پسلی شق ہوئی اور اس میں سے ایک شخص نمودار ہوا جو عین مین اجنبی جیسا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اجنبی کی جگہ سنبھالی اور بولا:

''اے لوگو مجھے تازہ لہو کے پیالے پیش کرو۔''

اس پر سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں پوچھا:

''یہ کون ہے؟''

لیکن خوف کے مارے سارے چپ رہے۔

(اس خاموشی کو توڑنے کے لیے مَیں واحد متکلم سامنے آتا ہوں)

میں نے پوچھا---"تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

اس نے میری بات پر بہت غصہ کیا۔

"او نادان! کیا تُو مجھے نہیں پہچانتا؟"

میں نے کہا "نہیں"۔

اس نے غصے سے سر جھٹکا۔"تو جلد ہی جان جائے گا۔"

اور اس نے کسی کو پکارا۔ پلک جھپکتے میں اس کی پسلی سے بھورے سینگوں والے نے سر ابھارا اور چابک لہراتا ہوا میری جانب بڑھا۔

اسی لمحہ میری پسلی سے شدید درد اٹھا اور چند لمحوں بعد اس نے سر ابھارا جس نے پہلے اجنبی کی اطاعت سے انکار کیا تھا۔ وہ باہر آیا اور بولا:

"اے اجنبی! جان کہ تیرا اقتدار ختم ہوا۔"

اجنبی تلملا اٹھا---"کیا تم نہیں جانتے کہ میری اطاعت تم پر فرض کر دی گئی ہے۔"

پھر ایک توقف کے بعد بولا:"میرے قریب آ کہ مَیں تجھ پر مہربان ہوا۔"

میرے ساتھی نے یہ سن کر حقارت سے زمین پر تھوکا اور کہنے لگا:

"میں تیری عنایتوں پر لعنت بھیجتا ہوں اور سن لے کہ میں تیری اطاعت سے منحرف ہوتا ہوں۔"

تب اجنبی نے کچھ سوچ بچار کیا اور بولا---"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ بہت پہلے ایک شخص نے انحراف کیا تھا اور تصدیق کہ وہ منکروں

میں شمار ہوا۔''

میرے ساتھی نے قہقہہ لگایا --- ''او بے وقوف کیا تو نہیں جانتا کہ وہ میرا باپ تھا اور جان لے کہ میرے بعد میرا بیٹا بھی یہی کرے گا۔''

اجنبی نے سر جھکا لیا۔

میرے ساتھی نے سہمے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور بولا --- ''سامنے آؤ''۔

کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

وہ بولا --- ''تم ڈرتے ہو، لیکن مَیں امید بن کر تمھارے دلوں میں اتر جاؤں گا۔''

اور وہ پکارا۔ اس کی پکار کا سب سے پہلے میرے چھوٹے بیٹے اور بیٹی نے جواب دیا اور وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے سامنے آ گئے۔ پھر دوسروں کو بھی حرکت ہوئی اور ایک ایک کر کے انہوں نے اجنبی کو گھیر لیا اور چیخنے لگے۔

اجنبی نے کچھ توقف کیا، پھر بولا---

''مَیں نے تمہاری درخواست قبول کی۔ اب تم صرف نصف پیالے تازہ لہو کے دیا کرو۔ اور اپنے کھیتوں کی ہریالی میں سے بھی صرف نصف۔''

لوگ خوشی خوشی اپنے گھروں کو لَوٹے۔

اور جب لوگ خوشی خوشی گھروں کو لَوٹ رہے تھے، میرے ساتھی نے کہا:

''اے لوگو یہ کیا کر رہے ہو؟''

یہ سن کر سب نے غصہ کیا اور بولے---

''تُو فتنہ پھیلانے والا ہے اور ہر چیز میں کیڑے نکالتا ہے۔''

بہت دنوں بعد لوگوں نے دیکھا کہ اجنبی نے اور پیالوں کا تقاضا کیا اور

ہریالی میں سے بھی اور حصہ مانگا۔

تب میرا ساتھی پھر میری پسلیوں سے طلوع ہوا اور کہا:

''ایک لوگو! سچائیوں کو جاننے کا وقت آ گیا ہے۔ مَیں پورب سے پچھم تک ایک لکیر کھینچوں گا کہ جاننے والے جان جائیں۔''

اور اس نے ایک لکیر کھینچ دی۔

سکوت کی دیوار جگہ جگہ سے تڑخ گئی۔

اجنبی مسکرایا اور اس نے کسی کو اشارہ کیا۔ مجمع میں سے ایک سفید ریش باہر نکلا اور مَیں نے پہچانا کہ یہ پہلے سفید ریش کا بیٹا تھا۔ اس نے مجمع کو ایک نظر دیکھا اور بولا ---

''کیا تم نہیں جانتے کہ اطاعت ہم پر فرض ہے اور کیا تم منکروں میں شامل ہونا چاہتے ہو۔ اور تحقیق کہ منکر آخرت میں شعلوں کا حصہ بنیں گے۔''

میرے ساتھی نے تلملا کر اسے دیکھا:

''کیا تو نہیں جانتا کہ لوگ تجھے پہچان چکے ہیں۔ اور تو ہمیشہ ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔''

سفید ریش نے لحہ بھر توقف کیا اور بولا ---

''تو انکار کرنے والوں میں ہے اور دیکھ میں بھی پورب سے پچھم تک ایک لکیر کھینچتا ہوں۔''

اور اس نے بھی لکیر کھینچی۔

سارے لوگ دو حصوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کو مارنے لگے۔

اور کہانی یوں آگے بڑھی اور سنانے والے سناتے ہیں کہ بعد ایک مدت کے

ان میں سے ایک اپنی ماں کے پاس گیا اور سوال کیا کہ اب وہ کیا کریں۔

ماں نے کہا --- ''افسوس میرے بیٹے ایک دوسرے کے درپے ہوئے، انہوں نے سچ کو نہ پہچانا۔''

پوچھنے والے نے پوچھا --- ''سچ کیا ہے؟''

ماں بولی --- ''سچ تو تیری پسلیوں سے پیدا ہوا تھا۔''

پوچھنے والے نے تاسف کیا --- ''اب کیا کریں؟''

اس سنانے والے سناتے ہیں کہ وہ لکیر کے دونوں طرف کھڑے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی بحث کر رہے ہیں اور اجنبی مسکراتا ہے۔

بحث بہت زوروں پر ہے۔

~~~~~~~
~~~~~~~

کھیل

جب وہ ہال میں داخل ہوا تو کھیل شروع تھا۔ سٹیج پر مٹیالے رنگ کا پہاڑ پاؤں پسارے لیٹا تھا اور اس کے قدموں میں پھیلا شہر مینڈک کی طرح ٹرا رہا تھا۔

وہ نیم تاریکی میں رینگتا جلدی سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چار آدمی جھاڑیوں میں سے رینگتے پھسلتے پتھروں پر پاؤں جمائے مسلسل اوپر چڑھ رہے تھے۔ اِن کے سانس پھولے ہوئے تھے اور آنکھوں میں تذبذب اور بے یقینی کی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ ایک مسطح جگہ دیکھ کر ان میں سے ایک رک گیا۔ اس نے کندھے پر لٹکا تھیلا دھپ سے چٹان پر پھینکا اور بولا --- "اس بوجھ کو اٹھاتے میں تھک گیا ہوں۔" دوسرے تینوں نے مڑ کر اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر وہ چاروں وہیں بیٹھ گئے۔ خاموشی سے انہوں نے اپنے تھیلے کھولے اور روٹی کے سوکھے ٹکڑے نکال کر چپ چاپ کھانے لگے۔

اس کی آنکھیں اب کچھ کچھ تاریکی سے مانوس ہو گئی تھیں۔ اس نے کن انکھیوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سارے لوگ اپنی اپنی کرسیوں میں دھنسے ہوئے پورے انہماک سے تماشے میں گم تھے۔

پہاڑ کی چوٹی کی طرف جاتے ہوئے وہ چاروں اب اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے تھیلے کندھوں پر لٹکائے اگلی چٹان پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ منظر رواں دواں تھا اور تصویر سکرین پر پوری طرح عیاں تھی۔

دفعتاً سٹیج سیاہ ہو گیا۔

کرسیوں میں دھنسے ہوئے لوگوں نے چند لمحے توقف کیا، پھر پہلو بدلنے کے ساتھ ساتھ سرگوشیوں کے چھوٹے چھوٹے دائرے اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے۔

سٹیج اسی طرح سیاہ اور خاموش رہا۔

سرگوشیوں کی آواز دھیرے دھیرے اونچی ہونے لگی۔ کسی نے درمیان میں سے چیخ کر پوچھا --- "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بھی اپنی کرسی پر نیم کھڑا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ کر خاموش سٹیج کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت سٹیج کا ایک کونہ روشن ہو گیا اور ایک شخص جس نے تھیٹر کے ملازموں کی وردی پہنی ہوئی تھی، نمودار ہوا اور تماشائیوں کی طرف منہ کر کے کہنے لگا ---

"حضرات اب آپ ایک نیا کھیل ملاحظہ فرمائیں گے۔"

"پہلے کھیل کا کیا ہوا؟" کسی نے چیخ کر پوچھا۔

اس شخص نے سوال اَن سنا کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ---

"ہمیں یقین ہے کہ یہ نیا کھیل آپ کے لیے مفید ثابت ہو گا۔"

"لیکن پہلا کھیل ......" بولنے والے کی آواز درمیان ہی سے ٹوٹ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ تھیٹر کے ملازم بولنے والے کو اٹھا کر باہر لے جا رہے تھے۔ چند لوگوں نے احتجاج کرنا چاہا --- کچھ اپنی قطار سے آگے نکل آئے۔

"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ --- کھیل شروع ہو گیا ہے۔"

تماشائی ایک ایک کر کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ دو چار جو ابھی تک اپنی جگہ کھڑے تھے، انہیں آگے پیچھے والوں نے پکڑ پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا دیا۔

کھیل شروع ہوا۔

کسی جنگ کی تیاری کا منظر تھا۔ ایک شخص جنگ کی افادیت اور ضرورت پر

تقریر کر رہا تھا۔ پھر سپاہیوں کی قطاریں ایک دوسرے کے پیچھے چلتی آگے بڑھنے لگیں۔

ہال میں کسی نے سرگوشی کی ---''ہم یہ کھیل نہیں دیکھنا چاہتے۔''

ایک اور سرگوشی ---''ہمیں جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

سرگوشیاں دائرہ در دائرہ ہال میں تیرنے لگیں۔ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں بولا ---

''ہم یہ کھیل نہیں دیکھیں گے، ہمیں جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

سٹیج پر تھیٹر کے باوردی ملازم نمودار ہوئے اور کود کر ہال میں آ گئے۔ احتجاج کرنے والا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ انہوں نے اچھل کر اسے دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے۔ احتجاج کی آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ کچھ اپنی جگہ بیٹھے شور مچانے لگے۔

ہاؤ ہو اور ملی جلی آوازیں۔

کھیل روک دیا گیا --- بتیاں جل گئیں۔

ایک شخص سٹیج پر نمودار ہوا۔

''یہ کون ہے --- کون ہے؟' لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

''میں نیا منیجر ہوں'' آنے والے نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش کیا ---
''حضرات پہلا منیجر بَرطرف کر دیا گیا ہے۔ اب ہم آپ کی پسند کا کھیل دکھائیں گے۔''

ایک سرگوشی: ''اسے کس نے منیجر بنایا۔''

''خاموش --- خاموش''

''پلیز خاموش رہیے اور کھیل دیکھیے۔''

لوگوں نے اطمینان سے سیٹوں پر پاؤں لمبے کیے۔ کھیل شروع ہو گیا۔

منظر تیزی سے بدلنے لگے۔ خارش زدہ منظر اپنی زخمی انگلیوں سے اپنا بے شناخت چہرہ کھجلانے لگے۔

کھیل جاری رہا۔

دو تین تماشائیوں نے کرسیوں پر پہلو بدلا۔ چند اور نے بھی پہلو بدل لئے۔

ایک نے سرگوشی کی --- ''یہ کیا دکھایا جا رہا ہے۔''

دوسری سرگوشی --- ''یہ کیا ہو رہا ہے۔''

قدرے اونچی آوازیں --- ''یہ کیا ہو رہا ہے۔''

کھیل رک گیا۔ سٹیج خاموش ہو گیا۔ بتیاں جل گئیں۔

مینجر سٹیج پر نمودار ہوا ---

''خاموش خاموش یہ کھیل کے آداب کے خلاف ہے۔''

ایک آواز --- '' لیکن یہ ہو کیا رہا ہے۔ ہم یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہتے۔''

''دیکھنا پڑے گا۔'' مینجر غصے سے للکارا۔

''نہیں، ہم نہیں دیکھیں گے۔''

لوگ سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سٹیج پر باوردی ملازم مینجر کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ پھر مینجر نے ہاتھ اٹھا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا ---

''بہت بہتر ہم آپ کو آپ کی پسند کا کھیل دکھائیں گے۔''

اسی دوران کرسی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کسی نے دیوار پر لگے بلب پر پتھر بھی

پھینک مارا۔ بلب ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ باوردی ملازم ہال میں دوڑنے لگے۔ چند کرسیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں۔ مینجر ہاتھ اٹھا اٹھا کر چپ رہنے کا اشارہ کرتا رہا۔

''ہم اپنی مرضی کے کھیل خود چلائیں گے۔''

آوازیں --- شور۔

مینجر اور اس کے باوردی ملازم چپ کرانے کی ناکام کوشش کرتے رہے لیکن لوگ ایک نوجوان کو کندھوں پر اٹھائے سٹیج پر چڑھ گئے۔ مینجر اور باوردی ملازم ایک طرف دھکیل دیے گئے۔

کچھ وقفے سے کھیل شروع ہوا۔

اب منظر میں کھیت کارخانے اور شہر تھے۔ لوگوں نے اپنی اپنی سیٹیں سنبھال لیں۔ ہال میں رفتہ رفتہ مکمل خاموشی چھا گئی۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب سے وہ ہال میں داخل ہوا تھا۔ یہ پہلا اطمینان تھا۔ اسے لگا وہ خود سٹیج پر موجود ہے۔ لمحے دف بجاتے، ناچتے گزرتے رہے۔

دفعتاً کھیل رک گیا --- ہال میں روشنی ہو گئی۔

''کیا ہوا --- کیا ہوا'' مختلف آوازیں۔

سٹیج پر ایک شخص نمودار ہوا --- ''حضرات میں نیا مینجر ہوں۔''

''نوجوان کہاں گیا --- تمہیں کس نے مینجر بنایا۔''

''حضرات نوجوان کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اب آپ نیا کھیل دیکھیں گے۔''

ہال میں شور مچ گیا۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ کچھ سٹیج کی طرف دوڑے۔ تھیٹر کے باوردی ملازم ڈنڈے اور بندوقیں لے کر ہال میں داخل ہوئے اور لوگوں کو زبردستی سیٹوں پر بٹھانے لگے۔ ایک ڈنڈا اس کے بازو پر بھی لگا۔

اس نے بازو کو دباتے ہوئے ساتھ والے سے کہا ---

''جب سے میں آیا ہوں، ہر پانچ منٹ بعد ایک نیا مینجر آ کر کھیل رکوا دیتا ہے۔ آخر یہ سلسلہ کب ختم ہو گا۔''

ساتھ والے نے اسے گھورا --- ''خاموشی سے دیکھتے رہو۔''

''نہیں میں خاموش نہیں رہ سکتا۔''

''تو پھر کسی اور تھیٹر میں چلے جاؤ۔''

وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔

کھیل شروع ہو چکا تھا۔ بنجر منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔ لوگ بے اطمینانی سے سیٹوں پر پہلو بدل رہے تھے۔ وہ چپ چاپ باہر نکل آیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم بڑھا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ کوئی کہہ رہا تھا ---

''لوگ انتظامیہ کی مرضی کے کھیل نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لیے سیٹھوں نے سوچا ہے کہ یہ تھیٹر ہی بند کر دیا جائے۔''

وہ چابک کھائے گھوڑے کی طرح بل کھا کر مڑا اور دوڑتا ہوا ہال میں آیا۔

بے معنی منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔

''تھیٹر بند کرنے کی سازش ....''

ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے منہ پر ایک زوردار مُکا پڑا۔ انتظامیہ کے کئی افراد اس پر ٹوٹ پڑے۔ گرنے کے وقفے کے دوران آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے دیکھا، سٹیج پر ایک عجیب افراتفری ہے اور ایک نیا شخص کہہ رہا ہے ---

'' حضرات میں نیا مینجر ہوں اور اب آپ ....''

~~~~~~~
~~~~~~~

سکرپٹ

کھیل انتہائی جذباتی دور میں داخل ہو گیا تھا۔ تماشائی دم سادھے اپنی اپنی نشستوں پر جمے ہوئے تھے کہ اچانک ایک اداکار اپنی جگہ سے ہٹ کر درمیان میں آ گیا اور ہیجانی کیفیت میں لرزتی آواز میں چیخا---

''میں اپنی مرضی سے کھیل چلاؤں گا اور اپنی پسند کے مکالمے بولوں گا۔''

سٹیج کے دائیں کونے میں پردے کے پیچھے بیٹھا ڈائریکٹر کھڑا ہو گیا---

''یہ کیا کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔''

لیکن اسی لمحے تماشائیوں نے، جو اسے بھی کھیل کا حصہ سمجھ رہے تھے، مسلسل تالیاں بجا کر اداکار کو خراج تحسین پیش کیا۔ ڈائریکٹر اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور اپنے نائب سے کہنے لگا----

''سکرپٹ میں تو یہ نہیں مگر تماشائیوں نے اسے پسند کیا ہے اس لیے اسے سکرپٹ میں شامل کر لو۔''

سٹیج پر ایک اور بات ہوئی۔ ایک اداکار اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے آیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا---

''اگر یہ اپنی مرضی کے مکالمے بولے گا تو میں اس کھیل سے علیحدہ ہوتا ہوں۔''

پھر وہ سٹیج سے اترا اور درمیانی راستے پر دوڑتا ہوا ہال سے نکل گیا۔ تماشائی اسے بھی کھیل کا حصہ سمجھے۔ یہ مکالمہ اور عمل انہیں کچھ زیادہ ہی پسند آئے۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ ڈائریکٹر جو پھر اپنی نشست سے اٹھ بیٹھا تھا، بیٹھ گیا اور اپنے

نائب سے کہنے لگا ---

"اسے بھی سکرپٹ میں شامل کر لو۔"

اب سٹیج پوری طرح ڈائریکٹر کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ اداکار اپنے اپنے مکالمے بول رہے تھے۔ تماشائیوں کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کھیل کی کیا صورت بن رہی ہے۔ تماشائیوں میں دفعتہً ایک شخص اٹھا اور سٹیج پر چڑھ گیا۔ اس نے سٹیج پر موجود اداکاروں کو، جو اپنے مکالمے بھول کر یا جان بوجھ کر دوسری باتیں کر رہے تھے، ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف ہٹا دیا۔ اداکار سٹیج کے ایک کونے میں سمٹ گئے۔ اسے بھی کھیل کا حصہ سمجھا گیا۔ تالیاں بجیں۔ تالیوں کے شور میں نئے شخص نے اعلان کیا:

"کھیل وہیں سے شروع ہوتا ہے، جہاں سے گڑبڑ ہوئی تھی۔"

سٹیج کے پیچھے ڈائریکٹر نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا، نائب نے پوچھا ---

"سر اِسے بھی سکرپٹ میں شامل کر لوں۔"

سٹیج پر اب یہ بحث شروع ہو گئی کہ گڑ بڑ کہاں سے ہوئی تھی، نووارد نے جسے اب اداکار تسلیم کر لیا گیا تھا، پوچھا،

"سب سے پہلے کس نے سکرپٹ سے بیوفائی کی۔"

متعدد آوازیں، متعدد اشارے۔

بحث شروع ہو گئی۔ تماشائی تالیاں بجاتے رہے، ایک اداکار جھنجھلا کر بولا:

"یہ کیسے تماشائی ہیں، جنہیں پتہ ہی نہیں چل رہا کہ کھیل سکرپٹ سے باہر ہو گیا ہے۔"

سٹیج پر اب باقاعدہ جھگڑے کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ آدھے اِدھر کہ کھیل

سکرپٹ کے اندر ہے اور آدھے اُدھر کہ کھیل سکرپٹ سے نکل گیا ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کا اداکار بولا ---

''جو بھی ہے، کھیل تو ہو رہا ہے اور تماشائی اسے پسند بھی کر رہے ہیں۔''

ایک نوجوان اداکار نے غصہ سے سر ہلایا ---

''مسئلہ کھیل کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں، سکرپٹ کا ہے --- سکرپٹ ہے کہاں۔''

''ڈائریکٹر کے پاس'' ایک دوسری اداکارہ بولی۔

ڈائریکٹر جو ماتھے پر ہاتھ رکھے اپنے آپ میں گم تھا۔ بار بار اپنا نام سن کر چونکا۔

''سکرپٹ لاؤ --- سکرپٹ لاؤ۔'' چھوٹے بڑے سب اداکار چیخ رہے تھے۔

''سکرپٹ کیا لاؤں'' ڈائریکٹر کا نائب بولا --- ''اس میں اتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ ---''

تماشائیوں نے اس پر بھی خوب تالیاں بجائیں۔

''جب ان کو سکرپٹ کی اہمیت ہی نہیں معلوم'' ایک اداکار نے دوسرے سے کہا --- ''تو سکرپٹ کے بغیر ہی چلو۔''

''لیکن کب تک'' دوسرے نے تشویش سے پوچھا۔

''جب تک چلے'' پہلے نے جواب دیا۔

کھیل شروع ہو گیا ہے۔ تماشائی ہر تبدیلی پر تالیاں بجاتے اور خوش ہو رہے ہیں۔ کھیل چلانے والے مطمئن ہو کر کھیل چلا رہے ہیں۔ ڈائریکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر تماشائیوں میں آ بیٹھا ہے۔ کھیل چل رہا ہے --- جب تک چلے!

~~~~~~~
~~~~~~~

پسلی کا رشتہ

ڈھولک کی تھاپ پر رقص کرتی ہوا میں بھی ایک گنگناہٹ تھی، معطر فضا میں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے مستقبل کے سہانے سپنے دیکھ رہے تھے۔ وہ ذرا ایک طرف ہٹ کر کرسی کی ٹیک سے منہ ٹکائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے خیال آیا ہر مرد کی حوا اس کی پسلی سے پیدا ہوتی ہے، پھر کہیں بچھڑ جاتی ہے اور ایک طویل عرصہ کاٹ کر دوبارہ اس سے آملتی ہے۔

درویش کہاں سے چلا، مہینوں سالوں کی مسافت طے کر کے اس شہر میں وارد ہوا، زندگی کی تگ و دو میں ہچکولے کھاتا شہر کی سڑکوں سے گزرا۔ اس کی حوا جو اس کی پسلی سے پیدائش کے بعد اس شہر میں آباد تھی، لیکن وہ نہیں جانتا تھا، نہ پہچانتا تھا۔ سب کچھ ایک طے شدہ انداز میں ہوا۔ پہلی رات اس کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا---

"معلوم نہیں میں تمہارا آئیڈیل ہوں یا نہیں لیکن تم میری آئیڈیل ضرور ہو۔"

اس وقت تو وہ کچھ نہ بولی۔ کچھ دن بعد اس نے سوال کا جواب دیا اور کہنے لگی---

"مشرقی لڑکیاں پہلی رات جس کے ساتھ بسر کرتی ہیں، وہی ان کا آئیڈیل بن جاتا ہے۔"

اس نے کہا--- "نہیں یہ بات نہیں"

''پھر کیا ہے؟''

''دراصل ہر حوا اپنے مرد کی پسلی سے جنم لیتی ہے، طویل بچھڑاؤ کے بعد جب وہ اپنے مرد کو ملتی ہے تو اپنی خوشبو پہچان لیتی ہے، اپنے بچھڑے آئیڈیل کو جان جاتی ہے۔''

وہ ہنسی --- ''میری اماں کہتی ہیں کہ جوڑے اوپر بنتے ہیں، یہاں تو صرف رسم ادا ہوتی ہے۔''

یہ بات بیٹی کی شادی پر اسے پھر یاد آئی۔ بیٹی کسی دوسرے شہر میں ہوسٹل میں تھی، دو چار دنوں کے لیے آئی تھی اور وہ اس کے لیے کچھ خریدنے بازار نکلے تھے، دکاندار نے کہا کہ تیار ہونے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگیں گے۔ بیوی بولی --- ''چلو گھر ہی چلتے ہیں، یہاں بازار میں کیا رکیں گے۔''

گھر کی طرف مڑے تو اسے خیال آیا، ایک جاننے والے عرصہ سے بلا رہے تھے اور یہاں سے قریب بھی تھے، کہنے لگا ''ادھر نہ چلیں، ملاقات بھی ہو جائے گی اور وقت بھی گزر جائے گا۔''

سب کو تجویز پسند آئی۔ وہاں ایک اور فیملی بھی آئی ہوئی تھی۔ چائے پیتے باتیں شروع ہو گئیں۔ خاتون خانہ بولی ---

''بھابھی ان کے بیٹے کے لیے کوئی رشتہ بتاؤ، بڑے اچھے لوگ ہیں۔''

پھر جانے اسے کیا ہوا --- بولی --- ''ارے یہ جو بیٹی بیٹھی ہے، باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

بیٹی کا تو جو حال ہوا، وہ دونوں میاں بیوی بھی ششدر رہ گئے۔ اس نے سوچا --- کیسی نامعقول خاتون ہے۔ اس طرح بھی کوئی ایسی بات کرتا ہے۔ شاید

یہی کیفیت دوسرے مہمانوں کی بھی ہوئی۔ الٹی سیدھی چائے پی کر انہوں نے جلدی کا بہانہ کیا اور نکل آئے۔ راستے میں بیٹی کا موڈ تو خراب تھا ہی، اس کا اپنا غصہ دیکھنے والا تھا۔

بظاہر بات آئی گئی ہو گئی، لیکن چل پڑی --- جس دن بیٹی کا نکاح تھا اس نے بیوی سے کہا --- ''سمجھ نہیں آتا، اس دن ہمیں کون وہاں لے گیا تھا۔''

ایسے سوالوں کا جواب تو مرشد ہی دے سکتا تھا، لیکن مرشد کسی لمبی یاترا پر نکلا ہوا تھا۔ اس رات سونے سے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا ---

''جو حوا جس مرد کی پسلی سے پیدا ہوتی ہے اس نے اسی کے پاس پہنچنا ہے۔''

درویش نے پھر سفر آغاز کیا اور چلتے چلتے جنگل میں اس مقام پر پہنچا، جہاں مورنی مور کے گرد ناچتے ہوئے ایسی بے خود ہوئی تھی کہ اپنے پاؤں کے بھدے پن کو بھی بھول گئی۔

درویش نے سوچا یہ بے خود ہونا بھی کیا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ مَیں سے تُو اور تُو سے مَیں بن جاتا ہے۔ لیکن حوا اپنے مرد کی پسلی سے جنم لے کر بھی مَیں ہی رہتی ہے، ان میں سے کوئی کوئی ہی تُو کے مقام پر پہنچتی ہے۔ گویا ایک ہی وجود سے جنم لے کر بھی مَن و تُو کا جھگڑا ختم نہیں ہوتا۔ عظیم وجود میں سے ایک وجود اور اس وجود میں سے ایک حوا، نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ جو ازل سے ابد تک جاری ہے۔

درویش خود ہی ہنس پڑا۔ ''یہ میں کس وسوسے میں پڑ گیا ہوں۔''

''اور وسوسہ ہونے کی نشانی ہے۔'' کہیں قریب ہی سے مرشد کی آواز آئی۔

اس نے مڑ مڑ کر، دائیں بائیں ہر طرف دیکھا لیکن مرشد دکھائی نہ دیا۔

''کیا میرے کان بج رہے ہیں؟'' اس نے سوچا، پھر کچھ دیر چپ رہ کر زور سے پکارا --- ''کیا تم ہو؟''

''ہاں میں ہوں'' مرشد کی آواز آئی۔

اس نے پھر چاروں طرف دیکھا، لیکن مرشد نظر نہ آیا۔

''شاید میں اسے آنکھوں سے تلاش کر رہا ہوں'' اس نے اپنے آپ سے کہا --- ''اور وہ ایسی حالت میں ہے کہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دے رہا۔''

''یہی سچ ہے'' مرشد کی سرگوشی سنائی دی۔

اب اس نے پھر دیکھا، یہ دیکھنا آنکھوں سے نہیں تھا، اور اس نے دیکھا کہ مرشد مور بنا مزے سے بیٹھا جھوم رہا ہے اور مورنی اس کے گرد ناچ ناچ کر ایسی بے خود ہوئی ہے کہ اپنے پاؤں کے بھدے پن کو بھی بھول بیٹھی ہے۔ درویش ہنسا --- ''سچ ہے کہ ہر حوا اپنے اپنے نر کی پسلی سے پیدا ہوتی ہے، بچھڑتی ہے لیکن کبھی نہ کبھی اپنی کھوئی ہوئی پسلی کو ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔''

~~~~~~~
~~~~~~~

بے شناخت

ایک عجب مخمصہ، چند دنوں سے، اسے اندر ہی اندر ادھیڑے جا رہا تھا۔
اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی، اس نے اسے جس طرح پالا تھا اور اپنا آپ اس پر وار دیا تھا، وہ بھلانے والی بات نہ تھی۔ ماں مری تو یوں لگا جیسے وہ بھی اس کے ساتھ دفن ہو گیا ہے، لیکن زندگی بڑی ڈھیٹ ہے، چند دنوں میں سب کچھ معمول کے مطابق چل پڑتا ہے، لیکن اس معمول میں اس کے دل میں ہمیشہ ماں سے بچھڑنے کی کسک رہی۔ یہ کسک کبھی کبھی اس وقت بڑھ جاتی جب خیال آتا کہ اس کے پاس ماں کی کوئی تصویر نہیں۔ ان دنوں تصویر کھینچنے کا رواج بھی نہیں تھا، کیمرے ہوتے کہاں تھے، بس کسی خاص موقع پر تصویر بن گئی تو بن گئی۔ شاید کسی ایسے موقع پر ماں کی تصویر بھی بنی ہو لیکن اس زمانے میں تصویریں سنبھالی بھی کہاں جاتی تھیں۔ ماں یوں بھی پرانے خیالات کی تھی، شاید اس نے تصویر کبھی کھنچوائی ہی نہ ہو۔ باپ کی تصویر موجود تھی۔ وہ اسے دیکھتا تو خیال آتا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے ساتھ ماں کی تصویر بھی ہوتی۔ لیکن تصویر ملتی کہاں سے۔

وہ ان کے بڑے بُرے دن تھے۔ زندگی بسر نہیں ہو رہی تھی، لمحہ لمحہ کے ساتھ اُن کی جندڑیاں کٹ رہی تھیں، لیکن ماں نے کبھی احساس نہ ہونے دیا۔ وہ جوں توں کر کے اس کی ہر خواہش پوری کرتی، اور اب جب اس کے پاس سب کچھ تھا، ماں نہیں تھی۔ اسے خیال آتا، کم از کم اس کی تصویر ہی ہوتی، یہ تصویر ہی دیکھتی کہ اب اس گھر میں کیا کچھ نہیں ہے، پھر سوچتا دُور خلاؤں سے شاید ماں کبھی کبھی

جھانک لیتی ہو، اور شاید کبھی علم اتنا پھیل جائے کہ وہ جھانکتے ہوئے اس کی تصویر لے لے، لیکن اس وقت تک وہ کہاں ہو گا، وہ بھی شاید کسی ایسے ہی جھروکے سے جھانک رہا ہو، وقت کے جھروکوں سے جھانکنا بھی عجب ہے، نسلیں نسلوں کو جھانکتی ہیں، لیکن کیا ان میں کوئی رشتہ ہوتا ہے، مگر یہ تو ماں ہے اور ماں بھی ایسی جس نے اپنی ساری بیوگی اس پر قربان کر دی۔

وہ وقت کے منہ زور گھوڑے کی طنابیں کھینچ کر اس کو روکے رکھنے کی قوت تو نہ رکھتا تھا کہ ماں کو لمبے سفر پر جانے سے روک لیتا، لیکن کم از کم تصویر ہی ---؟ زندگی کی نعمتوں، بچوں کی قلکاریوں اور زندگی کی رنگارنگیوں میں تھم کر، مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے، لیکن ایک لمحہ، کوئی ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جو اپنا ہے اور اس اپنے لمحے میں مڑ کر دیکھتا تو ماں ہی نظر آتی اور خیال آتا اس کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں۔ کبھی کبھی سوچتا کاش! کوئی ایسا کیمرہ ہوتا جو اس کے ذہن میں موجود ماں کے ہیولے کو تصویر میں بند کر دیتا۔

ان ہی لہروں میں ڈوبتا ابھرتا، زندگی کا سفر کٹے جا رہا تھا کہ ایک دن، ایک پرانی کتاب میں سے چھوٹا سا لفافہ مل گیا جس میں ماں کی تصویر تھی۔ لگا جیسے اب تک جو کچھ اس کے پاس تھا، بے معنی تھا۔ تصویر چھوٹی سی تھی۔ ایک ہی دن میں سکین ہو کر تصویر بڑی ہو گئی، پرنٹ نکل آیا تو وہ اسے فریم والے کے پاس لے گیا، لیکن فریم والے کو تصویر دیتے ہوئے، ایک شک نے اس کے وجود میں کہیں آنکھ کھولی۔

"کیا یہ ماں ہی کی تصویر ہے؟"

"اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ وہ واپس مڑا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا --- کچھ دیر چپ بیٹھا رہا۔ پھر تصویر لفافے میں سے نکالی اور غور سے دیکھنے لگا۔

''یقیناً یہ ماں ہی کی تصویر ہے!''

لیکن اطمینان کی قوس قزح لمحے بھر ہی میں گھنے کالے بادل تلے ڈوب گئی۔

''شاید یہ ماں کی تصویر نہ ہو''

وہ اسی تذبذب میں سٹیئرنگ کے آگے بیٹھا، کبھی تصویر نکالتا، کبھی اسے دوبارہ لفافے میں رکھ دیتا۔

رات گئے گھر لوٹا تو بیوی نے پوچھا ---''دیر کیوں کر دی''

پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی ---''کچھ پریشان لگ رہے ہو''

اس نے نفی میں سر ہلایا ---''نہیں، بس تھکاوٹ سی ہے''

یہ کیسی تھکاوٹ تھی، اسے رات بھر نیند نہ آئی۔ جس تصویر کے لیے وہ تڑپتا تھا، اب ملی تھی تو شک کی چلمن بھی ساتھ ہی چلی آئی تھی۔

کروٹیں بدلتے بدلتے خیال آیا کہ کسی سے پوچھ لینا چاہیے اور اس کے لیے سب سے مناسب بڑی بہن ہی ہے۔ صبح وہ دفتر جانے سے پہلے ہی بہن کے گھر جا پہنچا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل گئی اور بچوں سے کہنے لگی ---''آج تو عید ہے، تمہارے ماموں صبح صبح ہی آ گئے ہیں۔''

وہ کچھ نہ بولا، چپکے سے لفافہ بہن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بہن نے حیرت سے اسے دیکھا، لفافے میں سے تصویر نکالی اور خوشی سے اچھل پڑی ---

''ارے ماں کی تصویر''

اطمینان کے پرندے نے اپنے رنگ برنگے پَر پھیلائے، اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھا ---''یہ ماں ہی کی تصویر ہے نا'' بہن کو کچھ سمجھ نہ آیا اور وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ سنبھلا --- ''میں نے سوچا تمہیں دکھا دوں، چلتا ہوں دیر ہو رہی ہے۔''

وہ بیٹھنے کو کہتی ہی رہ گئی لیکن وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سوچا اس وقت فریم کی دکانیں کھلی نہیں ہوں گی۔ واپسی پر کرا لوں گا۔ سارا دن دفتر میں فائلوں پر پھول کانٹے بناتے گزر گیا۔ سیٹ سے اٹھا تو ملگجا اندھیرا دبے پاؤں رقص کر رہا تھا۔ وہ دفتر سے سیدھا فریم کی دکان پر پہنچا۔ گاڑی سے نکلتے دفعتاً خیال آیا --- ''کہیں آپا سے غلطی تو نہیں ہو گئی۔ اس کی عمر میں مغالطہ ہو ہی جاتا ہے، یہ ماں کی تصویر ہے بھی کہ نہیں۔''

ایک پاؤں اندر ایک باہر --- کتنی ہی دیر وہ اس حالت میں رہا، پچھلی گاڑی والے نے ہارن دیا تو وہ چونکا اور اندر ہوتے ہوئے دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔

اس رات پھر وہی کشمکش رہی --- ہاں، نہیں --- نہیں، ہاں --- نیند آنکھوں میں چیونٹیاں بن کر رینگنے لگی تو سوچا، چھوٹی بہن سے پوچھ لینا چاہیے، اس کی یادداشت ٹھیک ہے۔

چھوٹی بہن صبح صبح ہی اسے دیکھ کر حیرت سے بولی ''بھیا خیریت ہے نا، دفتر نہیں گئے۔''

اس نے کچھ کہے بغیر لفافہ بہن کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ بہن نے لفافہ کھولا، ایک لمحہ تصویر دیکھتی رہی، پھر بولی --- ''ماں''۔ اس نے دوسری بات نہ کی اور تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر لفافے میں ڈالی اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ دفتر سے نکل کر فریم والے کی طرف جاتے ہوئے اطمینان سا تھا، لیکن تصویر دیتے ہوئے خیال آیا، بہن کچھ دیر چپ کیوں رہی تھی، شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی،

اس کا مطلب ہے کہ اس نے فوراً نہیں پہچانا --- تو کیا؟

شک ساری رات اس کے وجود کو ادھیڑتا رہا۔

''یہ تصویر کس کی ہے --- میں کون ہوں۔ میری ماں کون تھی، میری کوئی ماں تھی بھی کہ نہیں ---'' پھر خود ہنس پڑا، ماں نہیں تھی تو میں کہاں سے آیا --- ماں تو تھی مگر مجھے اس کا چہرہ یاد کیوں نہیں --- اسے اپنے آپ سے گھن سی آئی، اتنی مہربان ماں اور میں ایسا احسان فراموش کہ اس کا چہرہ بھی یاد نہیں۔

اب وہ روز سونے سے پہلے تصویر لفافے میں سے نکالتا ہے، کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے، پھر لفافے میں رکھ دیتا ہے۔ رات بھر نیند نہیں آتی، دفتر میں بھی فائلوں پر پھولوں کی جگہ کانٹے اور کانٹوں کی جگہ پھول بن جاتے ہیں۔ بیوی اور بچے شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھا لائے ہیں۔ حکیموں کا علاج بھی ہو چکا، لیکن اس کی بیماری کی تشخیص نہیں ہو سکی۔ روز بروز وزن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھیں اندر دھنستی چلی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر اس کا مرض نہیں جان سکے، جان بھی نہیں سکتے کہ وہ کسی کو کیا بتائے کہ ایک عجب مخمصہ ہے، جو اسے اندر ہی اندر ادھیڑتا چلا جا رہا ہے کہ وہ کیسا بیٹا ہے جو اپنی ماں کو بھی نہیں پہچانتا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

آشنا نا آشنا

سفر کا آغاز ہوا تو منزل معلوم نہ تھی، لیکن چند ہی لمحوں میں نہ آغاز کا احساس رہا نہ اختتام کا، بیٹھتے بیٹھتے دائیں طرف نظر پڑی اور پھر کچھ یاد نہ رہا۔ ان آنکھوں میں عجب سحر تھا، لگا یہ آنکھیں اسی کی منتظر ہیں، لیکن نہ چلبلا پن نہ چمک، بس ایک خاموش گہرائی --- اس کی منتظر۔ صدیوں سے اس کی راہ تکتے تکتے اداسی سی آ گئی تھی۔ ان آنکھوں کے آس پاس اوپر نیچے کیا تھا اس کی تو خبر ہی نہ ہوئی۔ نہ کچھ جانچنے پرکھنے کا موقع ملا۔ یہ اداس اداس آنکھیں تو خود ایک دنیا تھیں، وہ ان میں داخل ہو گیا، کب اور کیسے خود اسے بھی معلوم نہ ہوا۔ اب نہ کوئی من تھا نہ تُو، نہ بس نہ مسافر۔

وہ آنکھیں تھیں اور وہ --- لیکن اب وہ بھی نہیں تھا، ان آنکھوں کی وادیوں میں اترا ہوا ایک بے نام وجود، آگے منظر ہی منظر تھے۔

سرمئی دھند میں لپٹے دو مجسمے، وقت کی دھول میں اَٹے ہوئے۔ اپنے آپ کو پہچان کر اس نے دوسرے مجسمے کے سینے پر انگلی پھیری، دھول میں لکیر بن گئی۔ دوسرے مجسمے کی آنکھیں بند تھیں اور سارا وجود تیرتے ہوئے نگینے کی طرح ڈھلکیں مار رہا تھا، اس نے آہستگی سے اسے دوبارہ چھوا۔ بند پپوٹوں پر دستک ہوئی اور خاموش گہری آنکھیں اس پر مرتکز ہو گئیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی۔ لمحے سمٹ گئے اور ننھے ننھے پنکھ پھیلائے واپس مڑنے لگے۔

وہ تلوار سونتے قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پاس پہنچی تو دفعتاً تلوار

کو ایک طرف پھینک کر بولی --- ''تیرے دیکھنے کو، یوں آئی ہوں ورنہ کوئی اپنے پر بھی تلوار چلاتا ہے۔''(۱)

تخت پر شعلہ ناچا، ایک کریہہ آواز گونجی اور لفظ کوندتی بجلی کی طرح ان پر گرے۔ تلوار سونتے جلاد قدم قدم قریب آ رہا تھا، وہ اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔ ''تیرے ساتھ جی تو نہ سکی لیکن تیرے ساتھ مرنے کی آرزو تو پوری ہوئی۔''

لہراتی تلوار کی چمک نے فضا میں اداس سُر پھیلا دیے اور خون کی چھینٹوں نے درباریوں کے قیمتی کپڑوں پر نقش بنا دیے۔ گہری اداس آنکھوں میں مسکراتی چمک نے سنہری پنکھ پھیلا دیے۔

منظر بدلا ---- اب آس پاس لوگ مختلف تھے لیکن صورتِ حال وہی تھی۔ مندر کی ساری گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ سفید چوغہ پہنے، دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے، کرخت آواز میں نامانوس لفظوں کا ورد کرتے وہ مڑا اور ان کے قریب آ گیا۔ وہ دونوں بڑے گنبد سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی، مسکرائے جا رہی تھی۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا تھا، ایک طویل چپ، ٹھہرے ہوئے وقت کی جھیل میں کنکر گرا، لہریں دائرہ در دائرہ رقص کرتی کناروں کو چھونے لگیں۔ سب منظر ایک جیسے تھے، لمحہ بھر کی خوشی اور پھر فضا میں لہراتی تلوار کی چمک، ایک ایسا سفر جس کی کوئی منزل نہیں، چلتے رہنا، چلتے رہنا ---- بس بھی چل رہی تھی، درمیان میں کہاں کہاں رکی، کون چڑھا کون اترا ---- اسے کچھ خبر نہ ہوئی، اب شاید آخری اسٹاپ آ گیا تھا، مسافر سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے اپنے بیگ اتار رہے تھے ---- وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ بیگ پکڑا، جانے سے پہلے مڑ کر دیکھا ----

وہ اپنی سیٹ پر گم صم بیٹھا، بس دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بھی لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔ اتنے میں اسے لینے والا اندر آ گیا اور اس کا بیگ اٹھا لیا۔ پھر دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف چل پڑے۔ اترنے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا، یوں لگا خاموش اور اداس آنکھوں میں موتی سا ڈھلکا ہے، پھر وہ تیزی سے اتر گئی۔ لینے آنے والا پاس کھڑی گاڑی میں بیگ رکھ رہا تھا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے پھر مڑ کر اسے دیکھا --- جو اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا، شیشے میں سے دیکھے جا رہا تھا۔ گاڑی رینگتی سڑک پر پہنچ گئی اور ٹریفک کے سیلاب میں بہہ گئی۔ وہ اسی طرح چپ بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا۔

اسے بھی کسی نے لینے آنا تھا۔ جب دیر تک وہ سیٹ سے نہ اٹھا تو آنے والا اندر آ گیا اور اس کے پاس آ کر بولا ----

"سر آپ ٹھیک تو ہیں نا۔"

وہ چونکا --- "ہاں ہاں ...... ٹھیک ہوں۔" آنے والے نے اس کا بیگ اٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"سارے مسافر اتر گئے لیکن آپ سیٹ سے اٹھے ہی نہیں، میں تو ڈر گیا تھا۔"

وہ کچھ نہ بولا ---- بولتا بھی کیا، لیکن اس نے اپنے آپ سے کہا ---

"یہ پہلی بار ہے، وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔"

"اکیسویں صدی جو ہے۔"

آنے والے نے بیگ اٹھاتے اٹھاتے مڑ کر کہا، اس نے شاید اس کی بات سن لی تھی۔

"اکیسویں صدی" اس نے دہرایا۔

''جی سر...... میری ماں کہتی ہے کہ اس نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اکیسویں صدی میں کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا...... بس ایک نفسا نفسی ہو گی۔''

''لیکن اس کی اداس آنکھوں میں ایک موتی تو تھا، اس نے سوچا، لیکن کچھ نہ بولا۔ اس قیامت کی گھڑی میں کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

سفر ناسفری

سفر کہاں سے، کب اور کیوں شروع ہوا تھا، اب اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا۔ اب گھور اندھیرا تھا اور گردن گردن اندھیرے میں ڈوبا طویل راستہ، جس پر چلتے رہنے کا ایک احساس تھا اور اندھیرا چٹکیاں کاٹتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ، یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وقت گزر رہا ہے، ٹھہر گیا ہے یا وہی رک گئے ہیں یا چلے جا رہے ہیں۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ اندھیرے کے ناخن تیز ہوتے جا رہے تھے اور اس کی چٹکیوں سے اٹھنے والی درد کی ٹیس بڑھتی جا رہی تھی۔ یہی ٹیس ہونے کی علامت بھی تھی کہ تھے یا نہیں تھے کا احساس کسی اور سطح پر موجود نہیں تھا۔

وہ بھی ان میں سے ایک تھا جنہوں نے اندھیرے میں سفر آغاز کیا تھا۔ اسے جتنا کچھ یاد تھا وہ یہی کہ اندھیرا اب چٹکیاں کاٹتے کاٹتے تند ہوا جا رہا تھا۔ شاید کبھی اندھیرا نرم گداز ہو اور شاید کبھی آس کی تہوں میں کوئی لچکیلا پن ہو لیکن عرصہ سے، جب سے اسے کچھ کچھ یاد ہونا شروع ہوا تھا، اندھیرے کا انداز اور خراج یہی تھا۔ روشنی کے بارے میں اس کے اور اس جیسے دوسروں کے تصور ایک سے تھے۔ وہ ہاتھ سے دائرے بناتے ہوئے سوچتا، روشنی بھی اندھیرے کی طرح نکورتی ہے۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ جب اس نے، اس جیسے دوسروں نے کبھی روشنی کو دیکھا ہی نہیں تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ اندھیرا ہے۔

وہ بہت دیر سوچتا رہا۔ ہو سکتا ہے یہ روشنی ہو اور اندھیرا کچھ اور ہو۔ بہت دنوں تک جب اسے اپنے سوال کا جواب نہ ملا تو ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے

ایک بزرگ سے پوچھ لیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر بولے۔

''معلوم تو مجھے بھی نہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ ایک بار باہر کی دنیا سے کوئی یہاں آیا تھا جس نے اس اندھیرے کا احساس کرایا تھا۔''

''اور تب سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم اندھیرے میں رہ رہے ہیں۔''

''شاید --- ہاں۔''

''اور اندھیرا اس لیے ہے کہ ہم ہر شے کو ٹٹول کر دیکھتے ہیں، اس کی پہچان نہیں رکھتے۔''

''شاید --- ہاں۔''

''اور میرے باپ نے بھی اسی اندھیرے میں زندگی گزار دی اور میں نے بھی اسی میں آنکھ کھولی اور زندگی گزار رہا ہوں اور میرے بعد میرا بیٹا بھی ---''

''شاید --- ہاں۔''

''اور میرے باپ کے لیے یہ اندھیرا اتنا کرخت نہیں تھا، شاید اس میں کوئی ملائمت ہو۔ میرے لیے وہ چٹکیاں کاٹنے والا ہے جن کی ٹیس کئی کئی دن محسوس ہوتی ہے، اس کے ناخن اب کافی بڑھ گئے ہیں اور تیز ہیں اور میرے بیٹے تک ---''

''شاید --- ہاں۔''

اس نے جھنجھلا کر بزرگ کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ ''آپ کے ہر جواب میں شاید کیوں ہے؟''

بزرگ ہنسے ''تمہارا سوال بھی تو ادھورا ہے، تمہارا جملہ بھی تو مکمل نہیں۔''

اب سوالوں اور خیالوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے باپ نے اس اندھیرے سے نکلنے کی جدوجہد کیوں نہیں کی۔ کیا اسے اپنے بیٹے کا خیال نہیں تھا ---نہیں تھا تو اس کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے آیا، کیسے آیا۔ بس سوال ہی سوال تھے اور جواب نہیں تھا۔ صرف اندھیرا تھا اور سفر تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ تھا بھی یا نہیں، اب تو اسے بار بار یہ خیال بھی آتا کہ سفر ہے بھی کہ نہیں، وہ چل بھی رہے ہیں یا ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دکھائی تو کچھ دیتا نہیں، پھر یہ کون بتائے کہ وہ چل رہے ہیں یا کسی ایک ہی جگہ رکے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی چل رہے ہوں اور اب رک گئے ہوں، اس گھور اندھیرے میں نہ کچھ سوجھتا تھا نہ کچھ سمجھ میں آتا تھا اور بتانے والا کوئی نہیں تھا، جس سے بھی کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا وہ اپنے سوال لیے ہوئے ہوتا۔ بس سوالوں کا ایک دائرہ تھا اور جواب ---

آخر کسی کو کچھ تو معلوم ہو گا، کوئی تو جواب دے سکتا ہوگا، وہ کون ہے، کہاں ہے؟

اب وہ اس کی تلاش میں تھا، کوئی نہ کوئی ضرور اندر کی بات جانتا ہے لیکن چپ سادھے بیٹھا ہے، وہ اپنے آپ سے کہتا، لیکن وہ ہے کون اور کیوں نہیں بولتا۔ بولنے پر بظاہر کوئی پابندی بھی نہ تھی بلکہ وہ سب ضرورت سے زیادہ بولتے تھے۔ ہر وقت بولتے ہی رہتے تھے بلکہ نیند میں بھی بڑبڑاتے رہتے تھے۔ آوازیں تھیں اور شور تھا لیکن ان میں پرندوں کی چہچہاہٹ نہیں تھی کہ مدتوں سے پھولوں نے کھلنا بند کر دیا تھا اور کوئی گیت نہیں تھا کہ عرصہ سے گیت نگار نے گیت لکھنا بند کر دیا تھا کہ کوئی گیت سننے والا نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ جو عرصہ سے چپ ہیں ضرور کوئی بات جانتے ہیں۔ پرندے تو جواب نہیں دے سکتے تھے، گیت نگار ضرور کچھ جانتا ہو گا۔ مگر

وہ ہے کہاں؟ اس گھور اندھیرے میں کہیں چھپا بیٹھا ہے کہ اب اس کے لیے چھپنے کے سوا اور کیا چارہ تھا؟ وہ اس کی تلاش میں لگ گئے، ہاتھوں سے ٹٹول کر، کبھی آوازیں دے کر وہ اسے ڈھونڈتا رہا لیکن وہ اسے نہ ملا۔ پھر جب وہ مایوس ہو گیا تو ایک دن اچانک ہی وہ اس کے قریب آ گیا۔ اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہا، دیر تک چپ رہا۔

اس نے پھر سوال دہرایا۔

''تم چپ کیوں ہو، بتاتے کیوں نہیں یہ اندھیرا کب ختم ہوگا؟''

وہ پھر چپ رہا۔

''کب ختم ہوگا یہ اندھیرا؟'' اس کی آواز میں اب ایک التجا تھی۔

دیر کی خاموشی کے بعد گیت نگار ایسی آواز میں جو بمشکل سنی جا سکتی تھی بولا۔

''شاید کبھی نہیں۔''

''کبھی نہیں۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔ ''کبھی نہیں۔''

''شاید کبھی بھی نہیں۔'' گیت نگار کی آواز میں آنسو چھلک رہے تھے۔

''اندھیرا تو کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جاتا ہے لیکن آنکھیں ہی نہ ہوں تو ......''

''کیا'' وہ چیخا اور اپنی آنکھوں کو ٹٹولنے لگا۔ ''کیا ہماری آنکھیں ہی ......''

اور اسے لگا اس کے کان بھی نہیں، اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اندر ہی کوئی سرسراہٹ سی ہے، ایک آہٹ سی اور بس ---! یہ عجب انکشاف تھا کہ اس کی آنکھیں ہیں نہ کان، وہ رو بھی نہیں سکتا، تو --- ہنس تو سکتا ہے اور غیر ارادی طور پر قہقہہ ایک فوّارے کی طرح اس کے ہونٹوں سے پھوٹ نکلا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

عشق نہ پُچھے

اس کے ساتھ تعلق کی ایک زمانی مدت تو تھی ہی لیکن لگتا یوں ہے جیسے یہ تعلق ازلوں ازلی ہے۔ چودہ پندرہ برس پہلے اس نے پہلی بار اسے دیکھا، اس سے پہلے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پرانے گھر میں، جو شہر کے قدیمی حصہ میں تھا، اس کی نہ ضرورت تھی نہ وہ وہاں پہنچ سکتی تھی۔ وہ گلیاں تنگ ضرور تھیں لیکن محبتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ضرورت کی ہر شے دروازے پر موجود تھی۔ صبح سویرے کلچے اور لسّی کا ناشتہ کر کے گلیوں گلی بڑے چوک میں آ نکلتا، جہاں کسی بھی جگہ جانے کے لیے ٹانگوں، سوزوکیوں اور ویگنوں کی لائنیں لگی رہتی تھیں۔ صدر کا کرایہ چار آنے تھا اور کوشش یہی ہوتی تھی کہ ایک طرف سے اسے بھی بچا لیا جائے۔ وہ تین ساتھی اکٹھے ہو جاتے تو گپ شپ لگاتے پیدل ہی چل پڑتے، محبتوں میں رچے ہوئے فاصلے بھی مختصر سے لگتے تھے۔ ہر شے بھری بھری سی تھی، منہ تک لبالب اور وہ ان میں گردن کو خم دے لکے کبوتر کی طرح غٹرغوں غٹرغوں کرتا پھرتا تھا، پھر آہستہ آہستہ نہ جانے کیا ہوا کہ چیزیں سکڑنے لگیں اور فاصلے بڑھنے لگے۔ بیوی اور بچوں کے اصرار پر اس نے پرانے شہر سے باہر پلاٹ لے لیا۔ اپنے طور پر اسے اب بھی یقین تھا کہ اسے بہکایا گیا ہے۔ وہ اس تنگ گلی سے نکلنا نہیں چاہتا کیونکہ اس تنگ گلی میں اسے اپنا آپ بڑا لگتا تھا اور نئے علاقے کی کھلی سڑک پر وہ بہت چھوٹا ہو جاتا تھا۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ ایک دفعہ پاؤں اکھڑ جائے تو آدمی پھسلتا ہی چلا جاتا ہے، اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

''یہ پلاٹ لینا ہی میری سب سے بڑی حماقت تھی'' وہ اپنے آپ سے کہتا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، پلاٹ لیا تو نیا گھر بننا بھی شروع ہو گیا۔ پرانا مکان بک گیا، نیا گھر بس بن ہی گیا۔ اب جانے کی باری آ گئی۔ وہ کئی دن اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرتا رہا۔ بچے کلکاریاں مار رہے تھے، بیوی کے پاؤں زمین پر نہ لگتے لیکن وہ اندر ہی اندر ٹوٹے چلا جا رہا تھا، یہاں رکنے کی اب کوئی صورت نہ تھی، آخر جانا ہی تھا۔

جس دن وہ نئے گھر پہنچے اسے لگا اس کی ماں آج ہی مری ہے اور وہ اسے دفنا کر قبرستان سے ادھر آ نکلا ہے۔ ماں کئی دن یاد آتی رہی، پھر کچھ معمول شروع ہوا تو آنے جانے کی دِقت کا احساس ہوا، نئے گھر کی چَٹ پر کچھ اکٹھا ہو گیا تھا، کچھ قرض لے لیا اور ایک سانولی سی شام سودا پکا ہو گیا۔ ماڈل تو خاصا پرانا تھا لیکن اتنے پیسوں میں یہی مل سکتا تھا، سو اس نے حسبِ معمول سر ہلایا اور اپنے آپ سے کہا ''چلو یہ بھی غنیمت ہے۔''

خود تو اسے سٹیئرنگ پکڑنا بھی نہیں آتا تھا اس لیے وہ دفتر کے ڈرائیور کو ساتھ لے گیا۔ ڈرائیور ہی اسے چلا کر لایا اور جب اس نے اسے پورچ میں کھڑا کیا تو بیوی بچے اندر سے دوڑے آئے اور اس کے ارد گرد کھڑے ہو گئے، اور اندر باہر دیکھنے لگے۔ وہ ایک کونے میں چپ چاپ سہما ہوا سا اس سوچ میں کہ اب اسے چلائے گا کون۔ ڈرائیور شاید اس کی مشکل سمجھ گیا، خود ہی بولا ---

''صاحب جی فکر نہ کریں میں روز شام کو آ جایا کروں گا، بس ہفتہ دس دن میں آپ سیکھ جائیں گے۔''

ہفتہ دس دن تو اسے اسٹارٹ کرنے اور سٹیئرنگ سیدھا کرنے ہی میں لگ

گئے، ڈرائیور اسے ایک کھلے میدان میں لے جاتا اور دائرے میں چکر لگوا کر دائیں بائیں مڑنے کی مشق کرواتا، شاید بیسویں پچیسویں دن جب اس نے پھر دوسرے کی بجائے چوتھا گیئر لگا دیا تو ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ دیے---

''سر مجھے تو معاف کر دیں، یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔''

دوسرے دن ڈرائیور خلافِ معمول شام کو نہیں آیا۔

''اب وہ نہیں آئے گا۔'' اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''آ کر بھی کیا کرے گا۔'' وہ غصہ سے بولی۔ ''تم کچھ سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔''

''اب اس عمر میں کیا سیکھوں گا۔'' اس نے جیسے خود سے کہا۔

دو تین دن وہ پورچ میں کھڑی رہی، دفتر میں کسی نے کہا کھڑے کھڑے بیٹری بیٹھ جاتی ہے، اس کا دل بیٹھ گیا۔ شام کو اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو تیار کیا اور اسٹارٹ کر کے میدان کی طرف نکل پڑا۔ میدان زیادہ دور نہیں تھا، اب یاد نہیں کہ چکر لگاتے لگاتے یا کہیں مڑتے مڑاتے مکالمہ شروع ہوا۔ چیزوں سے مکالمہ کرنے کی اس کی عادت بہت پرانی تھی۔ پرانے محلے میں بھی اس کے کئی دوست تھے، گلی کا گیٹ، خود گلی، نکڑ کا ٹیڑھا کھمبا، گھر کا بوسیدہ دروازہ، ان سب کے ساتھ اس کا مکالمہ چلتا رہتا تھا۔ آتے جاتے وہ ان کا حال پوچھتا وہ اس کی خیریت معلوم کرتے۔ اپنے کمرے کی دیواروں سے تو کبھی رات رات بھر مکالمہ ہوتا۔ دفتر میں وہ اپنی میز سے بھی گفتگو کر لیتا تھا۔ یہ سب اس کے دوست تھے جو اسے کبھی تنہائی کا احساس نہ ہونے دیتے۔

نئے گھر میں وہ اکیلا تھا۔ سڑک، کھمبے، حتیٰ کہ دیواریں بھی اس کے لیے

اجنبی تھیں، وہ اس کی بات ہی نہ سمجھتیں، وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو وہ چپ اکھڑی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہتیں، یہاں اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ لوگ بھی اجنبی اور ایک دوسرے سے بے زار بے زار سے اور چیزیں بھی اجنبی اور چپ چاپ سی۔ ایک چپ لگ گئی جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کیے جا رہی تھی، ایسے میں اس مکالمے نے اسے چہکا دیا، وہ خوشی خوشی گھر آیا۔

جب سے وہ نئے گھر میں آئے تھے وہ خاموش خاموش رہتا تھا۔ اسے یوں ہشاش بشاش سا دیکھ کر بیوی لمحہ بھر کے لیے چونکی---

''بڑے خوش نظر آ رہے ہو؟''

''صبح ویگن والے کو جواب دے دینا، پرسوں سے سب گاڑی میں جایا کریں گے۔''

''لیکن ......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، میں کر لوں گا۔''

یہ تبدیلی غیر معمولی سی تھی، بیوی کچھ بے یقینی سی کیفیت میں رہی، کہاں تو یہ کہ وہ سٹیئرنگ کو ہاتھ لگاتے بیزاری کا اظہار کرتا اور کہاں یہ جوش کہ سب کو لے کر نکلے گا، لیکن وہ اپنی جگہ پر سکون تھا۔ ''مکالمہ شروع ہو جائے تو دُوری ختم ہو جاتی ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا --- ''اب ڈرنے کی ضرورت نہیں، اب میری اس کے ساتھ دوستی ہو گئی ہے۔''

پھر دوستی کا ایسا دور شروع ہوا کہ مَن و تُو کا جھگڑا مٹ گیا۔ فاصلے سمٹ گئے۔ بیوی اور بچوں کو ان کے سکول چھوڑ کر اپنے دفتر تک لمبے فاصلے میں ڈھیروں باتیں ہوتیں، کبھی وہ بولتا تو وہ سنتی، کبھی وہ بولے چلی جاتی اور وہ سنے چلا جاتا۔ وہ اس

کا ہر لمحہ خیال رکھتا، ذرا سی تکلیف ہوتی تو اسے لیے مکینک کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کے دوست ہنستے ---

''یار تم نے اس پرانی گاڑی پر اتنے پیسے لگا دیے ہیں کہ اب تو صرف پَر لگانے ہی رہ گئے ہیں۔''

وہ اندر ہی اندر کھلکتا --- انہیں کیا معلوم کہ واقعی اس کے پَر ہیں اور ہم دونوں ان پَروں سے کہاں کہاں اڑتے پھرتے ہیں۔

اس کی توجہ اور گاڑی کے لیے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے رہنے سے بیوی بچے بھی اب چڑنے لگے تھے۔ بیٹا جو اب کالج میں آ گیا تھا کہتا ---

''اس پرانی گاڑی پر اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تو کیا کروں اسے کھڑا کر دوں؟ آخر پرانی گاڑیوں پر خرچہ تو آتا ہی ہے۔''

''بیچ کر نئی لے لیں۔'' بیٹا اصرار کرتا۔

اسے اس تصور ہی سے ہول آتا --- ''نہیں نہیں، ٹھیک چل رہی ہے۔ نئی کون سی مفت مل جائے گی۔''

ہر مہینے جب تنخواہ میں سے ایک بڑی رقم گاڑی کے کھاتے میں نکل جاتی تو بیوی کا موڈ کئی دن ٹھیک نہ ہوتا ---

''یہ گاڑی تو ہمیں کنگال کر دے گی۔'' وہ بڑبڑاتی۔

''پرانی بھی تو ہے لیکن ہمارا کام تو چل رہا ہے۔'' وہ وکالت کرتا۔

''میرا خیال ہے اس کی اور آپ کی عمریں برابر ہی ہیں۔'' بیٹا طنز کرتا۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔''

''میں تو کہتا ہوں اسے فوراً نکال دیں۔ ایک آدھ سال اور گزر گیا تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' بیٹے نے سمجھایا۔

''اور اس ایک آدھ سال میں یہ اس پر دس پندرہ ہزار اور لگا دیں گے۔'' بیوی غصے سے بولی۔

وہ کچھ نہ بولا، اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

''میں نے ان کے کہنے پر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی کہ پرانے محلے سے نکل کر یہاں آیا، لیکن اب میں اس غلطی کو نہیں دہراؤں گا۔''

اور اسے پرانا محلّہ یاد آ گیا۔ وہ تنگ سی لیکن محبت سے لبالب بھری گلی جو اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیتی تھی، کلچے والے کی دکان جہاں سے وہ روز صبح گرم گرم کلچہ لیتا تھا، اور دودھ والا، لسّی کا بھرا گلاس --- سارا دن کیا تازگی رہتی تھی اور اب ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور بدوضع جام، لگتا ہے میٹھی موم کھا رہے ہیں۔''

ان دنوں پھر کچھ اسی طرح کی کیفیت تھی، جیسے پرانے گھر میں آخری چند مہینوں میں ہوئی تھی، کچھ اکھڑا اکھڑا پن، کچھ بے زاری سی۔ ایک صبح سٹارٹ ہونے میں کچھ دیر لگ گئی تو اس نے ویسے ہی کہہ دیا ---

''میرا خیال ہے اب رنگ پسٹن بدلوا لینے چاہئیں۔'' بیوی اور بیٹے تو بھڑک اٹھے۔

''اب اس پر ایک پیسہ بھی نہیں خرچ کرنا۔'' بڑے بیٹے نے غصے سے کہا۔

''اور ہم نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' چھوٹے بیٹے نے گویا اسے اطلاع دی۔

''کیا؟''

''اگلے مہینے آپ ریٹائر ہو رہے ہیں ناں، آپ کو جو پیسے ملیں گے اس میں

کچھ ڈال کر ہم نے گاڑی بدلنا ہے۔'' بیوی نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ ان دنوں ویسے ہی اداسی تھی، دفتر سے تیس سال کی رفاقت ختم ہو رہی تھی۔ اس کی خاموشی پر بیوی بچے کھل اٹھے۔

''میں نے کہا تھا ناں ابو مان جائیں گے۔'' چھوٹے بیٹے نے خوشی سے کہا۔

مہینہ تو پَر لگا کر اڑ گیا۔ سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے اسے کچھ شرم سی آئی ---

''نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، میں نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ اپنے آپ سے کہتا یا اسے سناتا۔ کچھ معلوم نہ ہوتا، بس اس کی بڑبڑاہٹ جاری رہتی۔

ایک آدھ مہینہ پیسے ملنے میں لگ گیا۔ اس دوران کبھی ناشتے پر، کبھی کھانا کھاتے ہوئے دونوں بیٹے کسی نہ کسی حوالے سے گاڑی کا ذکر چھیڑ دیتے اور اسے ذہنی طور پر تیار کرتے کہ اب گاڑی کو نکال دینا چاہیے۔ وہ ہوں ہاں کر کے اٹھ جاتا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بیوی بچوں کے اصرار کے سامنے ٹھہرنے کی سکت اب اس میں نہیں تھی، کبھی بھی نہیں تھی، ہوتی تو وہ پرانا گھر ہی کیوں چھوڑتا۔ اور اب تو زندگی کی شام ہوئی جا رہی تھی، جدائی کے سلسلے شروع ہونے والے تھے۔

اسے دوپہر کو سونے کی عادت تھی، دفتر سے آ کر بھی وہ ضرور کچھ دیر آنکھ لگا لیتا تھا۔ اس دوپہر بھی وہ حسبِ معمول سو رہا تھا کہ بیٹے نے اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ---

''کیا بات ہے؟''

''ابو ذرا اس پر دستخط کر دیں۔''

''کیا ہے یہ؟''

''آپ دستخط تو کریں۔'' اس نے کاغذ اور قلم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
نیم غنودگی میں دستخط کر کے وہ پھر سو گیا۔ شام کو چائے پیتے ہوئے بیوی نے کہا ---

''ماشاء اللہ آپ کے دونوں بیٹے بڑے سیانے ہیں، انہوں نے گاڑی کی اچھی قیمت وصول کر لی ہے۔''

''کیا؟'' پیالی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

''آپ سے دستخط کرائے تھے نا، دوپہر کو۔''

''وہ ......'' وہ کچھ نہ کہہ سکا، بس اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ زندگی بھر اس نے یہی کیا تھا۔ کچھ نہ کر پائے تو چادر میں منہ لپیٹ کر پڑ رہنا۔

تین چار دن بعد بیٹے پھر پھرا کر اچھے ماڈل کی گاڑی لے آئے۔ نئی گاڑی خوبصورت تھی۔ بیوی بچوں نے کہا۔

''چلو آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔''

اس کا دل بیٹھ سا گیا ---- ''تم لوگ جاؤ، میں گھر ہی رہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' بیٹے نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔ ''آپ ہی چلائیں۔''

''میں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی بیوی بول پڑی ---- ''بچوں کی خوشی میں تو شریک ہو جائیں۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہاتھ سٹیئرنگ پر جم نہیں رہے تھے۔ دو ایک بار گاڑی لگتے لگتے بچی، پھر جب اوپر تلے اس نے گیئر غلط لگائے تو بیٹا رہ نہ سکا اور بولا۔

''ابو کیا کر رہے ہیں، آپ تو گیئر ہی توڑ ڈالیں گے۔''

اس نے بڑی مشکل سے گاڑی روکی اور بولا ---

''بیٹا تم چلاؤ مجھ سے نہیں چل رہی۔''

اور اسے لگا وہ واقعی گاڑی چلانا بھول گیا ہے۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

میں اور میرے کردار

میں اور میرے کردار، ایک دوسرے کے ساتھ زندہ ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ یہ کردار مجھے اپنے سے باہر کہیں دکھائی دیتے ہیں، آہستگی سے میرے قریب آتے ہیں اور پھر جست لگا کر میرے اندر کہیں گم ہو جاتے ہیں، مدتیں گزر جاتی ہیں، مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملتی، پھر کسی دن اچانک وہ میرے باطن سے نمودار ہوتے ہیں اور میری کسی کہانی میں لفظوں کا لباس اوڑھ کر اپنی ایک پہچان بنا لیتے ہیں، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ کردار میرے اندر ہی کہیں جنم لیتے ہیں، کسی دن اچانک باہر نکل کر ہجوم میں گم ہو جاتے ہیں، میں انہیں تلاش ہی کرتا رہ جاتا ہوں، ان کی پرچھائیاں میری کہانیوں میں بے نام کرداروں کی صورت 'دوسری ذات' کی تلاش بن جاتی ہیں۔

جس زمانے میں، میں واہ کالج میں تھا تو روزانہ بس میں آنا جانا ہوتا، جاتے ہوئے اکثر ایک بوڑھا شخص مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیتا، میلے کپڑوں، پھٹی جوتی اور گندے صافے میں بھی اس کے چہرے کی جھریوں میں زمانے رینگتے نظر آتے۔ وہ عموماً ٹیکسلا موڑ پر اتر جاتا۔ ایک دن وہ کسی سے باتیں کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ پتھر تراشتا ہے، ان سے ڈیکوریشن پیس اور مورتیاں بناتا ہے، کئی دن گزر گئے بس آگے پیچھے ہو جاتی تو میری اس سے ملاقات نہ ہوتی، ایک دن مجھے لگا کہ اس نے اپنی نشست سے جست لگائی ہے اور میرے اندر کہیں ڈوب گیا ہے۔ میں نے اسے تلاش کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ عرصہ گزر گیا، ایک دن کالج سے واپسی پر بس ٹیکسلا موڑ پر رکی تو وہ بوڑھا بہت سے دوسرے

لوگوں کے ساتھ میرے اندر سے نکل آیا۔ بس رک گئی، یا شاید چلتی رہی، سارا منظر بدل گیا۔

''میرے اندر کوئی چیز تیزی سے پھیلنے لگتی ہے۔ بس نے رفتار پکڑ لی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف کے مناظر تیزی سے دوڑ رہے ہیں، میرا وجود سیٹ کی گرفت سے نکل کر بس میں پھیلنے لگا ہے۔ کوئی میرے قریب سے سرگوشی کرتا ہے۔ میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں، باہر سنسناتی ہوئی ہَوا مسلسل بڑبڑا رہی ہے:

''ٹیکسلا...... ٹیکسلا...... ٹیکسلا......''

میرا وجود ساری بس پر چھا جاتا ہے۔ بس کے اندر کی ہر چیز اس میں سمٹ جاتی ہے۔ اب میں سڑک پر دوڑ رہا ہوں۔ کٹے پھٹے زخمی میدان تیزی سے پیچھے رہ رہے ہیں۔ چاروں اور دور دور تک زمین بنجر اور ویران ہے۔ اِکا دُکا درخت بھی نظر آ رہے ہیں۔ میرا وجود اب سڑک کی گرفت سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے لیکن دونوں کنارے مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ میں کناروں کے ساتھ ساتھ کئی میل تک دوڑتا چلا جا رہا ہوں، دفعتۃً ایک طرف کا کنارہ کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں سمٹ کر جلدی سے اس کی راہ باہر نکل جاتا ہوں اور تیزی سے پھیلنے لگتا ہوں۔ اب کوئی حدبندی نہیں۔ میں پورے میدان پر چھا رہا ہوں۔ چٹیل پن ختم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ گھنا لہلہاتا جنگل ابھر رہا ہے۔ میرا وجود پھر سمٹنے لگتا ہے۔''

یہ اقتباس میرے افسانے ''سمندر قطرہ سمندر'' سے ہے۔ اس افسانے کا خیال مجھے اس ادھیڑ عمر نے سجھایا تھا جسے میں بس میں جاتے دیکھا کرتا تھا۔ لمبے گھیرے کی شلوار، کھلی بانہوں کا میلا کُرتا اور پاؤں میں پھٹی جوتی والا یہ بوڑھا میرے اندر اتر گیا تھا اور جب باہر آیا تو اپنے ساتھ بڑے مندر کی رقاصہ کوشلیا، کلاکار

دیا شنکر، مدن موہن، پنڈت چندر، پروفیسر کلیم اور نجمہ محمود علی کو ساتھ لے آیا۔ یہ سارے کردار مجھے وقت کی قید سے نکال لے گئے۔ میں نے ٹیکسلا کی عظمتوں کو لشکارے مارتے دیکھا، پھر اس کے اجڑنے کا منظر بھی میرے سامنے آیا۔ اس کے کھنڈروں میں گائیڈ کی بات سنی:

''جی ہاں، یہ ٹیلہ کبھی مندر تھا جہاں گوتم کی داسیاں گیت گایا کرتی تھیں۔''

عنائت اللہ نے مجھ سے کہا تھا ...... ''موت کتنی بھیانک شے ہے۔ چیزوں کے چہرے مسخ کر دیتی ہے۔''

اور میں نے جواباً کہا تھا ...... ''ہاں، وہ انسانوں کی طرح شہروں پر بھی نازل ہوتی ہے، عنائت ہمارے چہرے کتنے بدل چکے ہیں۔''

اور پھر انہی کھنڈرات میں سے مَیں نے ٹیکسلا کو نیا جنم لیتے دیکھا تھا۔ وہاں ہیوی کمپلیکس بن رہا تھا۔ وہاں ایک بڑی اسلحہ ساز فیکٹری قدم جما رہی تھی۔ سارے علاقے پر چھائی دھوئیں کی چادر ٹیکسلا کی نئی زندگی کی نوید دے رہی تھی۔ مدتوں سے سویا ہوا یہ عظیم شہر آنکھیں مل رہا تھا۔ میں خوشی سے ناچنے لگا تھا۔ ٹیکسلا سانس لے رہا ہے...... ٹیکسلا سانس لے رہا ہے، اور میرے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا وہ بوڑھا زیرِلب مسکرا رہا تھا۔ اس کردار نے مجھے ''سمندر قطرہ سمندر'' جیسا افسانہ عطا کیا تھا جسے میں اپنے بہترین افسانوں میں شمار کرتا ہوں۔

بوڑھے پراسرار کردار مجھے اکثر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ایک شام ایک دوست کو لینے بس اڈے پر انتظار کرتے مجھے اسی طرح کا ایک بوڑھا دکھائی دیا جو ایک بینچ پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی لیکن وہ مجھے اپنی کہانی سنا گیا۔ میری کہانی

''پھول تمنا کا ویران سفر'' انہی خوشبوؤں کی عطا ہے جو ہم دونوں نے اسی بینچ پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کی تھیں۔

بعض کہانیاں عجب طرح جنم لیتی ہیں۔ فتح محمد ملک کی کتاب چھپ رہی تھی۔ اس کی کتابت اعجاز کھوکھر نے کی تھی۔ ایک اتوار ان کے گھر غلطیاں لگانے کا کام ہوا۔ واپسی پر میں جڑی ہوئی کاپیاں ساتھ لے آیا کہ ایک نظر دیکھ لوں۔ لفافہ ٹیکسی میں رہ گیا۔ دو تین دن تلاش ہوئی لیکن مسودہ نہ ملا۔ اعجاز کھوکھر کو کتاب نئے سرے سے لکھنا پڑی لیکن مجھے ایک عجب کہانی مل گئی۔ اس کہانی کا عنوان ''بانجھ لمحے میں مہکتی لذت'' ہے۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' بیوی اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ...... ''خیریت تو ہے نا، تم ٹھیک ہو نا۔''

وہ ایک لمحہ خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا ...... ''کل رات میں خود کو ٹیکسی میں بھول آیا ہوں۔''

بیوی نے لمحہ بھر کے لیے حیرت سے دیکھا لیکن اگلے ہی لمحے جھنجھلاہٹ اس کے سارے چہرے پر رینگنے لگی ...... ''کیا''

''ہاں'' وہ رک رک کر کہنے لگا ''ٹیکسی جب گلی کی نکڑ پر رکی تو بے خیالی میں مَیں خود کو پچھلی سیٹ پر ہی بھول گیا۔''

بیوی نے سر پر ہاتھ مارا اور بولی ...... ''تو یہ کون ہے؟''

''ارے واقعی یہ کون ہے؟'' اس نے اپنے آپ کو اور پھر بچوں کو دیکھا جو حیرت سے منہ کھولے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''واقعی یہ کون ہے؟''

لمحہ بھر خاموشی رہی، پھر بولا ...... ''ہو سکتا ہے یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور ہو جس کی ٹیکسی میں مَیں گھر آ رہا تھا، یا پھر کوئی اور ہو ...... کوئی بھی''

میرے پہلے افسانوی مجموعے ''بے زار آدم کے بیٹے'' میں تو بعض کردار اپنے اصلی ناموں سے بھی آ گئے ہیں۔ مثلاً سرور کامران، مظہرالاسلام وغیرہ اور کہیں یہ کردار (اور ب کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں۔ ''بے زار آدم کے بیٹے'' کے یہ دونوں بنیادی کردار میں اور مظہرالاسلام ہیں۔ میں (ہوں اور مظہر ب ہے۔ یہ ہم دونوں کی سچائیوں کی تلاش کا سفر ہے جو شاید مکمل نہیں ہو پایا لیکن یہیں ''ریت، رسی اور موت'' بھی ہے جس کے کردار جمیلہ شاہین، سرور کامران اور میں اپنی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ اسی مجموعے میں وہ لڑکی بھی ہے جسے تصویریں بنانے کا شوق تھا اور میں جب بھی اسے چھونے کی کوشش کرتا وہ رنگوں کی پیالی میں ڈبکی لگا جاتی۔ میں پہروں ان پیالیوں کے پاس بیٹھا اس کے باہر نکلنے کا منتظر رہتا۔ وہ باہر نکلتی تو یوں رنگوں میں لتھڑی ہوئی ہوتی کہ میری انگلیاں پھسل جاتیں اور پھڑ پھڑا کر اُڑ جاتی ...... دور، بہت دور۔

یہ وہ دور تھا جب میں ان کرداروں کو اپنے آس پاس تلاش کیا کرتا تھا، مل جاتے تو میری باچھیں کھل جاتیں۔ میں انہیں گھیر گھار کر اپنے تخلیقی سیلف کے حوالے کر دیتا جو ان کی تراش خراش کرتا رہتا اور پھر کسی دن بنا سنوار کر کسی کہانی کے طاق میں بٹھا دیتا۔ پھر میرے اندر کوئی ایسی تبدیلی آئی کہ میں نے کرداروں کو باہر تلاش کرنے کے بجائے اپنے اندر ڈھونڈنا شروع کر دیا کہ مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ میرے اندر جو جہان ہے وہ باہر کی دنیا سے کہیں بڑا، پراسرار اور عظیم ہے۔

میں پہلی بار کراچی گیا تو اعجاز راہی مجھے سمندر دکھانے لے گیا۔ سمندر کو پہلی

بار دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب محویت طاری ہوگئی۔ میں نے اعجاز سے کہا ...... ''میں پہلی بار سمندر دیکھ رہا ہوں، یہ لمحہ کتنا عجیب ہے۔''

دفعتۃً کوئی کھلکھلا کر ہنسا۔ یہ سمندر تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر بولا ...... ''میں تو ہمیشہ سے تمہارے اندر موجود ہوں، یہ حیرت کس لیے؟''

''دن کے وقت سمندر میرے گھر سے تیرہ سو چھبیس کلومیٹر دور ہوتا ہے لیکن جونہی رات گھنی سیاہ پلکیں اٹھا کر شہر کے چوک میں اترتی ہے، سمندر رینگتا رینگتا میرے کمرے کی دیوار سے آ لگتا ہے اور نرم لچکیلی انگلیوں سے بند کھڑکی پر دستکیں دیتا اور میرا نام لے لے کر پکارتا ہے۔''

(میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا)

ایک دن میں نے رخسانہ سے کہا تھا ...... ''میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔''

اعجاز راہی کے ساتھ سمندر کے کنارے کھڑے جب سمندر نے مجھے یاد دلایا کہ عرصہ سے، شاید ازل سے وہ میرے اندر ہے تو مجھے مرشد کی بات یاد آئی:

''مرشد نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی ...... اے خدا مجھے احدیت کے سمندر کی گہرائیوں میں داخل کر۔''

اس نے تأسف سے سر ہلایا ...... ''لیکن میں تو ابھی دنیا کے سمندر میں بھی نہیں اتر سکا۔''

مرشد مسکرایا ...... ''دنیا بھی تو وہی ہے۔'' (سمندر مجھے بلاتا ہے)

میرے افسانوں میں دو کردار جو کبھی سیال اور کبھی ٹھوس صورت میں بار بار نمودار ہوئے ہیں میری بیوی رخسانہ اور بیٹی سعدیہ کے ہیں۔ سعدیہ جب دودھ پیتی

بچی تھی تو میں اسے اپنے سینے پر لٹا کر اسی بڑے گنبد میں بیٹھ جاتا تھا جو میرے پرانے گھر میں تھا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے میں نے انکشاف کے کئی درجے طے کیے۔ وقت کو کبھی ٹھہرتے اور کبھی پَر لگائے اُڑتے دیکھا۔ میری کہانیوں میں بیٹی کے سارے کردار سعدیہ کے گرد گھومتے ہیں۔

اپنی ایک ایک کہانی کا دروازہ کھولوں تو کرداروں کا ایک ہجوم ہے، جن میں سے کچھ پہچان رکھتے ہیں، کچھ کے نام ہیں، کچھ بے شناخت اور بے نام ہیں۔ میرے بعض کردار ایسے بھی ہیں جو اگرچہ انسانی وجود نہیں رکھتے لیکن میرے ساتھ ان کا برتاؤ انسانوں جیسا ہے۔ یہ کردار مجھے کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں، مانوسیت ہوتی ہے تو ہمارا مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔ میرا گھر، میری گاڑی، سڑکیں، دیواریں اور گلیاں میرے کردار ہیں۔ نانک پورہ میں مَیں جس گھر میں رہتا تھا، اس کی ایک ایک اینٹ سے میرا مکالمہ ہوتا تھا۔ جن دنوں ہم اس گھر سے نئے گھر میں منتقل ہونے کے پروگرام بنا رہے تھے اور سامان سمیٹ رہے تھے تو مجھے لگا، وہ مجھ سے روٹھا روٹھا سا ہے، مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے الوداع کہتا، چنانچہ جس دن ہم نے اپنے نئے گھر گلستان کالونی میں منتقل ہونا تھا، میں علی الصبح گھر سے نکل گیا اور بیوی بچوں کو کہ گیا کہ دوپہر تک سامان سوزوکیوں میں لاد کر نئے گھر چلے جائیں اور چابی بیچنے والوں کو دے جائیں۔ میں صبح سویرے ناشتہ کیے بغیر ہی چپکے سے نکل گیا کہ میں اس لمحے کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا جب اس گھر کو تالا لگا رہا ہوتا۔ شام کو میں نئے گھر پہنچا تو سب لوگ سامان سمیت وہاں آ چکے تھے۔ دو ایک دن تو سامان سنبھالتے اور نئے گھر کی خوشی میں گزر گئے لیکن تیسری رات عجب ہوا۔ شاید آدھی رات کو یوں لگا جیسے باہر کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا، رخسانہ اپنی نیند میں

مست تھی، بچے اپنے اپنے کمروں میں نیند کے مزے لوٹ رہے تھے، مجھے احساس ہوا کہ شاید یہ میرا وہم ہو، لیکن گھنٹی دوبارہ بجی۔ میں اٹھا، باہر آیا، گیٹ کھولا، کیا دیکھتا ہوں کہ نانک پورے والا گھر سامنے کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر دکھ اور شکایت کا ایک تاثر ابھرا...... ''مجھے ملے بغیر کیوں چلے آئے؟'' میں کیا جواب دیتا، میں نے چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم تادیر ایک لفظ کہے بغیر ایک دوسرے کے جذبات کا جواب دیتے رہے۔

یہ غیر مرئی کردار میری کئی کہانیوں میں موجود ہیں لیکن میرے افسانوی مجموعی ''کاغذ کی فصیل'' کے اکثر کردار میری باہر والی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''کاغذ کی فصیل'' کی دونوں بہنیں ایک عرصہ تک واہ مین سبط علی صبا کے پڑوس میں رہیں۔ ان میں سے ایک ہماری کلاس فیلو تھی اور میں اور ایک اور دوست ہر ہفتہ انہیں ملنے واہ جاتے تھے۔ میں اس زمانے میں ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ چنانچہ یہ سارا افسانہ اسی ماحول میں پھوٹا اور یہی دو کردار اس کے مرکزی کردار بنے، البتہ ان کا بھائی جو افسانے میں بھی ایک فرضی کردار تھا، میرے تخیل کی پیداوار تھا۔ اسے میرے اندر کے افسانہ نگار نے تخلیق کیا تھا۔ اسی مجموعے کے ایک اور افسانے ''مکھن کا بال'' کا سارا منظر میں نے خود دیکھا تھا اور اس کے سارے کردار مجھے اس گاؤں ملے تھے جہاں میں اپنے ایک دوست سردار کے ساتھ ایک دن کے لیے گیا تھا۔

بعض اوقات کچھ تجربے اور کچھ مشاہدے بھی کرداروں کا روپ اپنا لیتے ہیں۔ شکر دوپہر میں کوٹھے کوٹھے پیتل کے لوٹوں کو تلاش کرتے صحن میں وہ منظر جس نے مجھے پہلی بار جسمانی لذت کا احساس دلایا یا نیم تاریک ڈیوڑھی میں خوشبو کی اپنائیت ''کاغذ کی فصیل'' کے دو تین افسانوں میں موجود ہے۔ یہ اس دور کی کہانیاں

ہیں جب ابھی میں نے علامت کی پُراسرار دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا۔ جنس اور لذت میرے لیے بڑے عجیب معنی رکھتے تھے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ میں اس دنیا سے نکل کر ایک نئی دنیا میں چلا آیا۔ یہ علامت کی دھندلی دنیا تھی، ''لیمپ پوسٹ'' جو میرا پہلا علامتی افسانہ ہے، کچھ حقیقت اور کچھ تخیل سے مل کر وجود میں آیا ہے۔

''لیمپ پوسٹ'' کا کردار ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ یہ کردار بھی کچھ حقیقت اور کچھ تخیل کی پیداوار ہے۔ اس افسانے کی ساری فضا میں جو اسرار ہے وہ میرے اندر کا اسرار ہے۔

میری کہانیوں کا ایک ایسا کردار ہے جس کا ذکر کئی کہانیوں میں ہے۔ یہ کون ہے میں نہیں جانتا، یہ ایک نسوانی کردار ہے، میں اسے اپنا آئیڈیل کہتا ہوں، جسے میں تلاش کر رہا ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ میں آج تک اسے اس کی مکمل صورت میں نہیں دیکھ سکا۔ مجھے اس کی آنکھیں نظر آتی ہیں، کہیں ہونٹ، کہیں زلفیں، کبھی میں اس کی آواز سنتا ہوں۔ یہ کردار میری کئی کہانیوں میں ہے۔ میں اس سے بچھڑا ہوا ہوں۔ اسی کے فراق کا دکھ اٹھا رہا ہوں۔ میری کہانی ''ایک کہانی اپنے لیے'' میں اس کی کئی پرتیں کھلی ہیں۔ مجھ سے کئی بار پوچھا گیا ہے کہ وہ کون ہے جس کے فراق کی کسک میری کئی کہانیوں میں موجود ہے۔ کیا یہ میری جوانی کا کوئی ناکام معاشقہ ہے۔ میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ میرے پاس اس کا جواب ہے بھی نہیں۔ اپنی یادداشتوں میں، میں نے اپنی محبتوں کا جو ذکر کیا ہے وہاں یہ لکھا ہے کہ میں کبھی کسی محبت میں سنجیدہ نہیں رہا، بس ایک ابال اور پھر خاموشی۔ یہ ٹھیک بھی ہے، لیکن یہ کردار کون ہے جو مجھے اکثر Haunt کرتا ہے، مجھے پکارتا ہے، اپنی طرف بلاتا ہے۔ کیا واقعی میری زندگی میں ایسی کوئی خاتون تھی۔ شاید ہو اور میں نے اپنے

لاابالی پن میں اس وقت تو اسے نظرانداز کر دیا ہو اور اب وہ میرے حواس پر چھا گئی ہو، لیکن یہ شاید درست نہیں۔ میں کچھ خواتین کے قریب ضرور گیا لیکن میرے مزاج میں جو جلد بازی اور اضطراب ہے اس نے مجھے کسی ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ میرا یہ کردار دراصل میرے اندر کے اضطراب کی علامت ہے۔ اضطراب اور بے چینی میری زندگی ہے۔ اس درویش کی طرح جو خدا سے ہمیشہ مضطرب رہنے کی دعا مانگا کرتا تھا، میں بھی اضطراب کی تمنا کرتا ہوں۔ بے چینی میرا تحرک ہے اور یہ کردار، جو میری کئی کہانیوں میں کسی نہ کسی صورت موجود ہے اسی بے چینی کی علامت ہے۔ اسے میرے اندر کے اضطراب نے تراشا ہے۔ میں نے حقیقی دنیا میں عشق کا دکھ نہیں اٹھایا، اس لیے اس کردار کے ذریعے میں نے دکھ اٹھانے کی اس کیفیت اور لذت کو خود تخلیق کیا ہے۔ میں اس کے لیے تڑپتا ہوں۔ اسے یاد کرتا رہتا ہوں اور پہروں اداس رہتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ مجھے چند لمحوں کے لیے کہیں مل جاتا ہے۔ بیوی کے ساتھ کسی سٹور سے نکلتے ہوئے، لمحہ بھر کے لیے اس کا سامنا ہوتا ہے۔ ٹھٹھک کر ایک دوسرے کو دیکھنا اور پھر اجنبی بن جانا۔ دیر تک اداسی کی لذت کو محسوس کرتے رہنا۔ یہ سب میرے اندر کی دنیا ہے۔ اپنے اندر بھی تو ہم بہت سے کرداروں اور ماحول کے ساتھ جی رہے ہوتے ہیں۔ یہاں وقت ایک سیل رواں نہیں۔ وقت ٹھہر بھی جاتا ہے، اور اس ٹھہرے ہوئے لمحے میں زمانے ایک ہو جاتے ہیں، لمحہ بھر میں حال سے ماضی، ماضی سے حال اور مستقبل میں قدم رکھا جا سکتا ہے۔ میرے افسانے ''تلاش'' کی ساری بُنت اسی تصور پر ہے۔ یہاں یہ کردار صدیوں سے میرے ساتھ ہے۔ زمانے بیت گئے ہیں، ظاہر کی چیزیں بدل گئی ہیں، لیکن اندر کی دنیا نہیں بدلی۔ میں جب تک سوچتا ہوں، میں ہوں اور جب تک میں ہوں میرا یہ

کردار بھی موجود ہے۔

میرے کرداروں کی جنم بھومی جیسا کہ میں نے کہا، اندر اور باہر دونوں دنیائیں ہیں، اور ان میں جو فرق ہے وہ ان دنیاؤں کے طور طریقوں کا فرق ہے۔ اندر کی دنیا کو دیکھنے اور جاننے بلکہ سمجھنے کے لیے بہت دور تک اندر اترنا پڑتا ہے لیکن یہ عجب بات ہے کہ جب آپ اپنے طور پر اندر کی یاترا کر رہے ہوتے ہیں تو آپ کائنات میں گھوم رہے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں اندر کی سرنگ سے ہوتے ہوئے آدمی خلاء میں کیسے پہنچ جاتا ہے۔ شاید باطن ایک دریچہ ہے جس کے دوسری طرف بے انت ہے۔ اسی لیے مجھے ذاتی طور پر وہ کردار زیادہ Haunt کرتے ہیں جو میرے اندر سے جنم لیتے ہیں، یوں ہوتا ہے کہ میں اکیلا کہیں جا رہا ہوتا ہوں، کہیں کسی موڑ یا اشارے پر گاڑی ذرا دھیمی ہوتی ہے تو کوئی کردار اگلا دروازہ کھول کر اچانک میرے ساتھ آ بیٹھتا ہے، مجھ سے باتیں کرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ غائب نہیں ہوا میرے اندر کہیں اتر گیا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی ہے، اچانک احساس ہوتا ہے کہ کوئی میرے ساتھ بیٹھا ہے، میں اسے دیکھتا ہوں، پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں اور ہماری گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ میرے اندر کی دنیا سے باہر نکلا ہے۔ ممکن ہے کہ باہر سے ہی اندر گیا ہو، عرصہ تک اندر کی دنیا کی سیر کرتا رہا ہو اور اب میری کہانی میں داخل ہونے کے لیے باہر نکل آیا ہو۔ باہر کے کردار بھی تو اندر ہی کی دنیا میں پکتے ہیں۔ جیسے کمہار کچی مٹی کو اپنے چاک پر ایک صورت عطا کر کے اسے پکنے کے لیے رکھ دیتا ہے، کبھی کبھار میرے ساتھ یوں بھی ہوتا ہے کہ میں بھول ہی جاتا ہوں کہ میں نے کسی کو پکنے کے لیے اپنے تخلیقی سیلف میں رکھا ہوا ہے۔ یہ تخلیقی عمل ہے بھی تو عجب پُراسرار،

اس کی گہرائیاں کون ناپ سکا، اس کے اسرار کون جان سکا، کہانی بن جاتی ہے، کبھی تھوڑی سی محنت کر کے بنانا پڑتی ہے، کبھی بنی بنائی آ جاتی ہے اور کردار، وہ بھی کبھی چلتے چلاتے مل جاتے ہیں، کبھی اندر سے باہر آ جاتے ہیں کہ اندر اور باہر دونوں دنیائیں اپنی اپنی معنویت، وسعت اور اسرار رکھتی ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا اندر کا جہان باہر والے سے زیادہ پُراسرار، بامعنی اور ہمہ جہت ہے اس لیے مجھے وہاں سے کردار تلاش کرنے اور انہیں اپنی کہانی میں سمونے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

~~~~~~~
~~~~~~~

رشید امجد کا نام اردو افسانہ نگاری کے ان نمایاں ناموں میں سے ایک ہے جن کا تخلیقی سفر جدید اردو افسانے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جاری رہا ہے۔ ان کی کہانیوں کا ایک اختصاص یہ ہے کہ وہ غیر مرئی کیفیات کو لفظوں کی گرفت میں لاتے ہیں اور چیزوں کو رشتوں اور نسبتوں سے پہچانتے ہیں۔ انسان اپنے اردگرد کے ماحول اور اشیاء سے جن نظر نہ آنے والے جانے اور انجانے رشتوں سے بندھا ہے، ان کی تفہیم و تجزیے کی کوشش ان کے ہاں جا بجا نظر آتی ہے۔ اس مطالعے کے لیے انہوں نے جن کرداروں کو چنا ہے ان میں زیادہ تر 'عام آدمی' ہیں۔ اس مجموعے کی زیادہ تر کہانیوں میں بھی ایسے ہی کردار اور مسائل ان کی تخلیقی واردات کا حصہ بنے ہیں۔

عابد سیال ________